سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

برصغیر کے مایۂ ناز مورخ ومحقق اور عالم دین

قاضی اطہر مبارکپوری رحمہ اللہ کی لاجواب تصنیف

جس میں

حضرات علی۔ حسین۔ ابن زبیر۔ معاویہ رضی اللہ عنہم۔ اور یزید عمر بن سعد اور عبید اللہ بن زیاد وغیرہم کے معاملات وقضایا پر حدیث اور تاریخ ورجال کی مستند کتابوں سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کتاب ‘‘خلافت معاویہ ویزید’’ کی افترا پردازیوں، غلط بیانیوں اور عبارتوں میں قطع وبرید کی کارستانیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے نیز جن کتابوں سے اس کے مولف نے اپنا غلط مقصد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان ہی کتابوں سے صحیح واقعات اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ طبع سلیم اور عقل مستقیم ان تشاجرات وقضایا کے بارے میں مطمئن ہوجائے۔

تلخیص

سید نفیس الحسینی

ناشر مکتبہ سید احمد شہید

اردو بازار لاہور

١

جمهرة انساب العرب

لابى محمد على بن احمد بن سعيد بن حزم الاندلسى

٣٨٤-٤٥٦

تحقيق وتعليق

عبد السلام محمد هارون

يزيد

كان قبيح الآثار فى الاسلام ؛ قتل أهل المدينة ، وأفاضل الناس ، وبقيتة الصحابة - رضى الله عنهم - يوم الحرّة - فى آخر دولته ، قتل الحسين - رضى الله عنه - وأهل بيته فى اوّل دولته ، وحاصر ابن الزبير -رضى الله عنه - فى المسجد الحرام ، واستخف بحرمة الكعبة والاسلام ، فأماته فى تلك الايام ؛

(صفحہ نمبر ١١٢)

دار المعارف بمصر

نمبرشمار	موضوع	صفحہ نمبر
۱	عرض مؤلف	۷
۲	اموی حکومت وخلافت	۹
۳	سرسری جائزہ	۱۶
۴	اسلامی تاریخ اور ائمہ علم وفن پر افتراء	۱۸
۵	اس کتاب کا اصلی ماخذ	۲۸
۶	جہالت وخیانت اور بد دیانتی	۳۰
۷	سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اُن کا دور خلافت	۳۶
۸	شاہ ولی اللہ کی تصریحات	۳۹
۹	علامہ ابن خلدون کی تصریحات	۴۲
۱۰	امام ابن تیمیہ کی تصریحات	۴۴
۱۱	امام ابن عبد البر اندلسی کی تصریحات	۴۵
۱۲	بیعت وخلافت کامل ومکمل تھی	۴۶
۱۳	حضرات طلحہ وزبیر ومعاویہ رضی اللہ عنہم اور اہل شام کا اقرار	۵۰
۱۴	سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر پورا عالمِ اسلام مجتمع تھا/ ایک اور نہایت معتبر شہادت	۵۴ / ۵۵
۱۵	شامیوں کی شرارت اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجبوری	۵۸
۱۶	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان فتنوں سے الگ رہے	۷۸
۱۷	سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت پر بلیغ تبصرہ	۸۰
۱۸	ان محاربات میں اقرب الی الحق کون لوگ تھے	۸۱

۱۹ سیدنا علی ؓ اور امام احمد بن حنبل ؒ ۸۲

۲۰ سیدنا علی ؓ اور قاضی ابوبکر بن عربی ۸۴

۲۱ سیدنا حسین ؓ اور ان کا مقام وموقف ۸۷

۲۲ اقدام حسین ؓ کی ضرورت کتاب وسنت کی روشنی میں ۸۸

۲۳ یزید کے خلاف اقدام کی شدید ضرورت اور سیدنا حسین ؓ کا مقام ۹۳

۲۴ امن وصلح کی کوشش اور اتمام حجت ۹۷

۲۵ اعتراف واحترام ۹۹

۲۶ امن وصلح خطرے میں ۱۰۱

۲۷ محمد بن حنفیہ ؒ کا مشورہ ۱۰۴

۲۸ بحق اسلام صبر وضبط ۱۰۶

۲۹ یزید کی روش اور عام صحابہ ؓ اور جمہور امت کا موقف ۱۰۹

۳۰ یزید اور اس کی ولی عہدی وامارت ۱۱۴

۳۱ مؤلف محمود احمد عباسی کے خیالات ۱۱۶

۳۲ سیدنا حسین ؓ کو گرانا اور یزید کو بڑھانا ۱۱۷

۳۳ حافظ ابن حجر پر الزام ۱۲۰

۳۴ علامہ ابن کثیر پر الزامات ۱۲۲

۳۵ کتاب فضل یزید کی حقیقت ۱۲۶

۳۶ یزید کی ولی عہدی کی داستان ۱۲۸

۳۷ ولی عہدی کی داستان ۱۳۱

۳۸ ولی عہد بنانے کی وجہ ۱۳۱

۳۹ یزید کی امارت وخلافت کس معنی میں تھی؟ ۱۳۲

۴۰ تین المناک واقعات ۱۳۴

۴۱ مؤلف اور ان کے نصرانی محققین ۱۴۰

۴۲ شمر کی رپورٹ ۱۴۲

۴۳ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور قاتلین حسین رضی اللہ عنہ ۱۴۵

۴۴ رأس الحسین ۱۴۶

۴۵ واقعہ حرہ مدینہ منورہ ۱۴۶

۴۶ محاصرہ مکہ مکرمہ ۱۴۸

۴۷ چند متفرق اور اہم مباحث ۱۴۹

۴۸ قاتل حسین رضی اللہ عنہ عمر بن سعد ۱۴۹

۴۹ صحابی بنانے کی کوشش ۱۵۷

۵۰ صحیحین کی حدیث پر بیجا کلام ۱۵۹

۵۱ حدیث غزوۂ مدینہ قیصر اور یزید ۱۶۱

۵۲ حدیث ملک عضوض ۱۶۸

۵۳ حشرج نباتہ کوفی ۱۷۲

۵۴ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن جمہان رحمہ اللہ ۱۷۴

۵۵ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ ۱۷۶

۵۶ بخاری کی دو حدیثیں ۱۷۷

۵۷ بارہ قریشی خلفاء ۱۸۱
۵۸ جاہ طلبی اور امارت کا شوق ۱۸۳
۵۹ قرابتیں اور رشتہ داریاں ۱۸۵
۶۰ حضرات حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ حسن سلوک ۱۸۷

عرض مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وآلہ واصحابہ اجمعین۔ ربنا لا تجعل فی قلوبنا للذین آمنوا

کتاب ”خلافت معاویہؓ ویزید“ صرف ایک چونکا دینے والی کتاب نہیں تھی بلکہ اس نے بہت سے عوام وخواص کو اسلاف کے اس مسلکِ حق سے ہٹانے میں مدد کی جو حضرات صحابۂ کرام اوران کے تشاجرات کے بارے میں دین و ایمان کی روشنی میں مسلم ہے۔ شروع میں ذمہ دار عالموں اوراداروں نے اس کتاب کی طرف توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا زہر خوب پھیلا۔ راقم الحروف نے روزنامہ انقلاب بمبئی میں ۷ نومبر لغایۃً ۱۷ دسمبر ۱۹۵۹ء (۴ جمادی الاولیٰ لغایۃً ۱۶ جمادی الثانیہ ۱۳۷۹ھ۔) ۳۵ قسطوں میں اس کی اندرونی خرابیوں کو اجاگر کرکے صحیح باتیں بیان کرنے کی کوشش کی اورصرف ان ہی کتابوں تک دائرہ بحث وتبصرہ محدود رکھا جن سے اس کے مؤلف نے قطع وبرید اورخیانت کرکے اپنا ذہنی مطلب نکال کراسے تحقیق اورریسرچ بنانا چاہا تھا، اب اسی کوحک واضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

اس کتاب پرلکھنے کا شدید تقاضا اس وقت ہوا جب کہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمیعت علماء ہند نے ایک مختصر مگر جامع تبصرہ میں اس کتاب کا پول کھول رکھ دیا۔ یہ ہماری کوشش گویا اسی متن کی شرح ہے۔ ہم نے صرف ان ہی چند کتابوں سے مدد لی ہے جن سے مؤلف نے خیانت کرکے اپنا ذاتی مقصد ثابت کرنا چاہا تھا اور جان بوجھ کر دوسری کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا ہے کہ ایک صحیح الفکر اور سلیم الطبع مسلمان کے لیے ان ہی سے مسلکِ حق کی طرف رہنمائی مل جاتی ہے اور کج فہم وکج دماغ کے لیے سب کچھ بیکار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جن بعض مباحث ہم نے اظہار خیال نہیں کیا ہے ان کو لے کراس کتاب کے طرف دار بغلیں بجائیں اوران کولاجواب تخلیق بتائیں۔ مگر جس شخص کی اس قدر خیانتیں اجاگر ہوچکی ہوں، اس کی ایک بات بھی ماننے کے قابل نہیں رہ سکتی جب کہ ایک کتاب میں دو چار جگہ اس کی خیانت سے پوری کتاب مجروح ہوجاتی ہے اوراس کی کوئی سطر بھی قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ اخبار میں تبصرہ کے زمانہ میں اس کی صرف ایک بحث ”کتاب کا اصل ماخذ“ پر چند لوگوں نے اپنے اپنے رنگ میں مؤلف کی تائید کی اور خود مؤلف نے راہ

پاکر اس پر اپنا ایک مضمون شائع کرایا اور ’’ایک سُنّی اہلِ علم و اہلِ قلم عالم‘‘ کی اس گرفت کو کئی طرف سے ڈھیلی کرنے کی کوشش کی گئی ، جو ہر اعتبار سے ناکام رہی ، حالانکہ انتظار تھا کہ ہمارے تبصروں کا جواب اس کتاب کے سرگرم طرفداروں کی طرف سے شدومد سے شروع ہوجائے گا، مگر ان کی سرد مہری سے اندازہ ہوگیا کہ ان کا مبلغِ علم و تحقیق کیا ہے اور ان کی طرف داری کیسی ہے۔

اب جبکہ اس کتاب کا فتنہ نسبتاً سرد پڑ گیا ہے اور دماغوں کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے ہمارا یہ تبصرہ خدا کرے قلبِ سلیم اور عقلِ مستقیم کے لیے مفید ثابت ہو۔ باقی رہے وہ لوگ جو سلف بیزاری کی بنیاد پر مشاجرات صحابہ کو دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے علم و تحقیق کی دوڑ اردو کی کتابوں اور اندرونی خواہشوں تک ہے وہ کسی طرح سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کے حق میں توفیق کی دعا کرنی چاہیے۔

ہم نے اس تبصرہ کے لیے اپنی ذاتی کتابوں کے علاوہ محترم و مکرم جناب الحاج حافظ محمد صدیق المیمنی (محمد احمد برادرز بمبئی) شرف الدین الکتبی واولادہ، اور کتب خانہ جامع مسجد کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے، ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں نیز اس کتاب کی اشاعت کے محرک و باعث میرے چند خصوصی دوست ہیں جن کا میں شکرگزار ہوں:

(۱) محترم الحاج مولانا عبید الرحمٰن صاحب قمر مبارکپوری

(۲) محترم الحاج محی الدین صاحب منیری

(۳) اور محترم الحاج نواب عبدالرؤف صاحب بستوی

درحقیقت ان ہی حضرات نے یہ کتاب شائع کی ہے

قاضی اطہر مبارک پوری بمبئی

جمعۃ الوداع ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ - مارچ ۱۹۶۰ء

اموی حکومت وخلافت 1

دولت اموی کی تشکیل وتعمیر نبوت وخلافت کے تصورات سے ہٹ کر قبائلی عصبیت اور خاندانی شوکت وقوت پر ہوئی اس لیے اس کی ابتداء میں دین کی خالص روح کارفرما نہ ہوسکی، بلکہ دنیاوی عصبیت وشوکت نے کام کیا اور چونکہ جو لوگ اس دولت جدیدہ کے اولین معمار تھے وہ خود بھی دین کی روح سے بڑی حد تک خالی تھے اور دینی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود ان کے دل ودماغ پر صاحبزادگی شاہزادگی اور دنیاوی جاہ وحشم کا خیال چھایا ہوا تھا اور نوخیزی اور ناتجربہ کاری نے ان کو بھی غیر مآل اندیش بنا دیا تھا، نیز انہیں ہم نوا اور مشیرِ کار ایسے لوگ مل گئے تھے جو دین ودیانت کے مقابلہ میں دولت وشوکت کے پروردہ تھے اور شام کی رومی حکومت کے قدیم سایہ نے ان کو ملوکیت پسند بنا دیا تھا اس لیے انہوں نے اس دولت کے قیام واستحکام میں دینی اصول وقوانین سے ہٹ کر وہ تمام آلات واثرات استعمال کئے جو ایک نئی حکومت کے ناتجربہ کار اور ناعاقبت اندیش کیا کرتے ہیں، چنانچہ اغلیمہ قریش، مروان ،عبیداللہ بن زیاد، یزید، عمر بن سعد وغیرہ دولتِ اموی کے اولین حکمرانوں نے اپنے ہم فکر وہم عمل پیرو کاروں کو لے کر اس کے استحکام میں وہ تمام کام کئے جو ایک نئی سلطنت کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ان نوخیز وناتجربہ کار صاحبزادوں کے ہاتھوں دولتِ اموی کے قیام واستحکام کا یہ دور امت مسلمہ کے لیے بڑا صبر آزما اور فتن تھا۔ اجلہ صحابہ موجود تھے، دین ودیانت کے حاملین دنیا میں بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ کبار تابعین اسلامی روح سے معمور تھے، اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر طرف کتاب وسنت کا چرچا تھا اور دین اپنی پوری روح کے ساتھ پورے عالم اسلام میں زندہ وپائندہ تھا۔ عین اسلامی فکر وعمل کے اس تابناک دور میں دین کی روح سے بڑی حد تک بے بہرہ نوخیزوں نے اپنے ایک خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کھلے بندوں ملوکیت کی دعوت عام کی اور ہر مخالف نظریہ کو طاقت وشوکت سے کچلنا چاہا۔ ان حالات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کمال دور اندیشی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان احادیث واحکام پر شدت سے عمل کیا جن میں اس قسم کے فتنوں کے نازک دور میں اسلام کی اجتماعیت وطاقت کو بحال وبرقرار رکھنے کے لیے حکم دیا ہے اور ہر طرح کے حالات برداشت کرکے ''بحق اسلام'' خاموش رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کی معیت واقتداء میں جمہور امت اس مصلحت کے پیش نظر خاموش نہ رہ جاتی اور اللہ نخواستہ ان اغلیمہ قریش کے مقابلہ میں نکل آتی جن کے پاس دنیاوی شوکت وطاقت جمع ہوگئی تھے تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ اسلام کی تلوار مسلمانوں پر پڑتی، اور عرب وعجم کی ساری مخالف اسلام طاقتیں مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر پورے عالمِ اسلام پر یلغار کردیتیں اور اسلام

کا سجا سجایا بازار دم کے دم میں لٹ جاتا اور وحدتِ کلمہ اور جامعیت اسلام کا وہ سارا کھیل اپنے ہاتھوں بگڑ جاتا[1] جسے نبوت و رسالت اور نیابت و خلافت سے تیئیس اور تیس سالوں کی مدت میں بنایا تھا۔ اگر حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے جمہور کے سامنے یہ مقصد عظیم نہ ہوتا تو وہ کسی طرح ان نوخیزوں کی اس سیاست کو نہ چلنے دیتے جو زمانہ جنگ کی طرح نئی حکومت کے قیام و استحکام میں دین و دیانت کی روح سے الگ کر کے چلائی گئی۔ یہ عبوری دور جمہور مسلمانوں کے لیے بڑی ہی سخت تھا اور ان کا تمام تر سکوت ''بحقِ اسلام'' تھا اور ''بحقِ دولت امیہ'' نہ تھا۔

یزید کا تقریباً پونے چار سال کا دور اس قسم کا تھا جس میں عام مسلمانوں نے بڑے صبر و ضبط سے کام لیا، مگر اسی دور میں ارباب عزیمت وقتی مصالح سے یکسو ہو کر اپنی خالص نیت اور پاکیزہ کردار کے ساتھ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس نازک دور کو ان احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے کا بہترین زمانہ سمجھا جن میں جبر وظلم اور احداث و بدعات کے خلاف آواز بلند کرنے کو افضل الجہاد بتایا گیا اور ان کے خلاف اقدام کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند مرتبہ ہونے کی ضمانت دی گئی۔ چنانچہ اسی دور کے شباب میں تین طاقتیں سامنے آئیں۔ ایک سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنواؤں کی طاقت جس کا خاتمہ عراق کی سرزمین کربلا محرم ۶۰ ہجری میں ہوا۔ دوسری پورے اہلِ مدینہ کی طاقت جس کی پشت پر مدینہ منورہ کے وہ انصار و مہاجرین تھے جن کی بیعت سے خلافت کی بیعت پوری ہو جاتی تھی اور جن کا گھر اسلام کا دار الخلافہ تھا۔ حرمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس اجتماعی طاقت کو مدینہ کے مقام حَرّہ میں ذوالحجہ ۶۳ ہجری میں دفن کیا گیا۔ اور تیسری طاقت حرم خداوندی میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں کام کر رہی تھی اور اس کے مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عین محاصرہ مکہ مکرمہ کے دوران ربیع الاول ۶۴ ہجری میں یزید کی موت واقع ہو گئی اور خرابی بسیار کے بعد بھی یہ طاقت بعد تک باقی رہی مگر پھر اُموی حکومت نے اسے بھی ختم کر کے اپنے لیے راستہ صاف کر لیا۔

چونکہ یہ تینوں طاقتیں اپنے مقصد میں ناکام رہیں، اس لیے فاتحوں کے نزدیک ان کا مقابلہ کرنے والے باغی، شورش پسند اقتدار اور حکومت وقت کے خلاف خروج کرنے والے ثابت کیے گئے اور ان کے کارناموں کو خروج و بغاوت کی نظر سے دیکھا گیا اور اگر ان میں سے کوئی طاقت کامیاب ہو جاتی تو پھر اسی طرح بنو امیّہ اور ان کے دعاۃ خلافت راشدہ کے باغی قرار پاتے اور ان کو وہ سب کچھ کہا جاتا جس کا عشرِ عشیر بھی ان کے ناکام مخالفین کو نہیں کہا گیا۔ مگر چونکہ وہ نئی حکومت کے قیام و استحکام میں کامیاب ہو گئے اس لیے استیلاء و غلبہ کی وجہ سے اموی دور حکومت بھی خلافت کا دور کہلایا

اور بنی امیّہ کی پوری حکومت اپنے اچھے اور برے کارناموں کے باوجود عمومی اعتبار سے بعد کی تمام مسلم حکومتوں سے زیادہ بہتر، زیادہ کامیاب، اور زیادہ نیک ثابت ہوئی اور ان کے حکمران پورے عالمِ اسلام کے بست وکشادہ پر قابض و دخیل تھے، جہاد کرتے کراتے تھے، حدود اور احکامِ اسلام جاری کرتے تھے، عزل ونصب ان کے قبضہ میں تھا، کتاب وسنت کی اشاعت وترویج میں حصہ لیتے تھے، اور اسلام کو ہر طرح کی عجمیت سے پاک وصاف رکھنے کے لیے بہترین کوشش کرتے تھے، اس لیے وہ ایسے کامل ومکمل غلبہ واستیلاء کے بعد خلیفہ کہلائے اور ان کی حکومت کو خلافت اسی معنیٰ میں تعبیر کیا گیا اور ملوکیت وشہنشاہیت کی تاریخ میں یہ دور خیر القرون ثابت ہوا۔ اور اس دولت کے قیام کے سلسلے میں جو عبوری کوششیں کی گئیں ملوکیت کی نظر میں ایک ایک کر کے مستحسن قرار پائیں اور ہر حادثہ بہترین کارنامہ مانا گیا۔

یہاں یہ بات خاص طور سے مدنظر رکھنی چاہیے کہ کسی نئی حکومت کے قیام واستحکام کے زمانے میں یا جنگ کے زمانے میں جو حالات پیش آتے ہیں اور ان کے مقابلہ سے جو جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں، وہ صرف عبوری اور وقتی ہوتی ہیں ان کو اس دولت وحکومت کے بنیادی مقاصد قرار دینا کسی طرح مناسب نہیں، کیونکہ جب کسی جگہ ملوکیت وسلطنت کی گرفت شروع ہوتی ہے تو اس قسم کے انقلابات وتغیرات پیش آتے ہیں اور ملوکیت کا جبر وتشدد اپنے لیے اسی طرح کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

”ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا ازلۃ وکذلک یفعلون “

”ملوک جب کسی شہر میں غلبہ واستیلاء کے لیے داخل ہوتے ہیں تو وہاں کی معزز ومحترم شخصیتوں کو ذلیل وخوار کر کے زیر کرتے ہیں۔ اور اسی طرح کے دوسرے کام کرتے ہیں“۔

آپ ملوکیت وسلطنت کی تاریخ پڑھیں تو بڑے بڑے عادل ومنصف اور بہترین امن پسند سلاطین اس مرحلہ پر تشدد پسند اور قتل وغارت میں معروف نظر آئیں گے۔ مگر غلبہ واستیلاء کا عبوری کارنامہ تھا، ان کی سلطنت کا مقصد نہ تھا۔ اسی طرح دولت اموی کے قیام واستحکام کے عبوری دور میں جو کچھ ہوا وہ اس کے مقاصد میں سے نہ تھا اور نہ اس کے بانی اسے اپنی حکومت کے لیے مستقل پالیسی اور اصول سلطنت سمجھتے تھے، بلکہ ان حرکتوں کو ان میں سے بہت لوگوں نے بعد میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اور توبہ واستغفار اور ندامت وشرمندگی کا اظہار کر کے افسوس کیا۔ چنانچہ دولت اموی کی ابتدائی تحریکوں میں جن لوگوں نے خاص مقصد یا دباؤ سے حصہ لیا، ان میں سے اکثر وبیشتر مرتے دم تک افسوس کرتے رہے، اور توبہ واستغفار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں رجوع ہوئے۔ اس کی بہترین مثال سیدنا

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے آخری وقت کے وہ الفاظ ہیں جو صحیح مسلم میں نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ جس میں آپ نے اپنی زندگی کے تین ادوار بتا کر آخری دور کو جو فتنوں میں گزرا، اس کے بارے میں فرمایا:

”ثم ولينا اشياء ما ادرى ما حالى فيها “

(آخر میں ایسے معاملات ہمارے سپرد کئے گئے جن کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ میرا حال کیا ہوگا)

عمر بن سعد قاتل حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا کے بعد مرتے دم تک رنج و افسوس کا اظہار کیا اور خود یزید کے بارے میں روایت موجود ہے کہ اس نے آخر میں شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر بے حد رنج و ندامت کا اظہار کیا اور اپنی ناعاقبت اندیش سیاست کے غلط ہونے کا اقرار و اعتراف کیا، اور کتنے ایسے اہلِ صدق و صفا بزرگ تھے جو ان فتنوں کے دوران ہی میں شرکت کو غلطی محسوس کر کے کنارہ کش ہوئے، نیز ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنی غلطی کا احساس کر کے خاندان حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ حرمین شریفین کے ساتھ حسنِ سلوک کیا اور رواداری کی روش اختیار کی، بلکہ بعد کے اموی خلفاء میں بعض نے اپنے دور میں اس ابتدائی سیاست کو سختی سے ناپسند کر کے اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور تلافی مافات کے لیے ہر امکانی کوشش کی۔ اس میں مروان کے پوتے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بہت ہی نمایاں ہے، جنہوں نے دور یزید کی غلط کاریوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا اور حجاج بن یوسف کے ظلم و سفاکی کو برملا ظاہر کیا اور ردّ مظالم کی روش اختیار فرمائی۔

بہرحال دولتِ اموی اپنے ان ابتدائی موانع و علائق کو ختم کر کے ترقی کرتی رہی اور اپنے پرانے عار کو اچھائیوں سے دھوتی رہی، مگر اس دور میں بھی وقتاً فوقتاً مخالفت ہوتی رہی اور ان کا صفایا ہوتا رہا۔ ان میں ایک طاقت بہت منظم صورت اختیار کر گئی اور اس نے بنوامیہ کے مقابلہ میں نسلی عصبیت کو دین کے رنگ میں پیش کر کے بڑی حد تک بنوامیّہ کی بدنامی پر اپنے استحقاق کی بنیاد رکھی۔ یہ بنو ہاشم کی امامت کی دعوت تھی جسے ایک مستقل دین کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اس میں بنوامیّہ کے وہ ابتدائی حریف شامل تھے جنہوں نے حسین رضی اللہ عنہ کو اپنا امام و پیشوا بنا کر کوفہ بلایا، تاکہ یزید کے مقابلہ میں آپ کی بیعت کریں، مگر جب اموی طاقت و سیاست سے دوچار ہونے کے بعد ان کی قوت ٹوٹ گئی اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے نتیجہ میں ان کی تحریک بند ہو گئی تو انہوں نے ایک خاص مدت تک خاموشی اختیار کی اور اندر ہی اندر بنوامیّہ کے خلاف کام کرتے رہے، اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے ان کی نالائقی اور اپنا استحقاق ثابت

کرتے رہے، یہ لوگ واقعہ کربلا کے کچھ زمانہ کے بعد اپنا لقب ''توابین'' اختیار کرکے طرفداران علی و حسین رضی اللہ عنہما کے رنگ میں ظاہر ہوئے جیسا کہ ابن سعد نے ''الطبقات الکبریٰ'' میں اس تصریح کی ہے۔ ان لوگوں نے اہل بیت کے بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح اپنا ہیرو بنایا جس طرح پہلے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بنا چکے تھے اور چونکہ بنی امیہ کو طاقت حاصل ہو چکی تھی اس لیے یہ لوگ اپنے مقصد میں ناکام ہوا کرتے تھے۔ اس گروہ نے اہل بیت اور واقعۂ کربلا کو اپنی تحریک کی روح بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور جس طرح دولت اموی کے قیام سے پہلے شہادت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دنیا کے سامنے پیش کرکے ہمدردی حاصل کی جارہی تھی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جارہے تھے اسی طرح اس گروہ نے شہادت حسین رضی اللہ عنہ کو دنیا کے سامنے پیش کرکے اپنی دعوت کے حق میں ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی، اور بنی امیّہ نے ابتدائی اوچھی حرکتوں کو، جو بجائے خود نہایت غلط تھیں، اپنے خاص رنگ میں پیش کیا اور چونکہ اس جماعت کی دعوت اہلِ بیت کی محبت تھی اس لیے مسلمانوں میں اس تحریک کو فروغ ہوا۔ خاص طور سے عجم کے ان علاقوں میں، جہاں قدیم زمانہ سے نسل و خاندان کا تصور کام کررہا تھا جیسے ایران و ہندوستان وغیرہ میں اس کی پذیرائی ہوئی اور ان ملکوں کے نومسلم نسلی فتنہ میں مبتلا تھے اس لیے انھوں نے اہل بیت کی محبت و مظلومیت میں دلچسپی لی اور ساتھ ہی ساتھ بنوامیّہ کی برائی کی۔ اس مقصد کے لیے واقعۂ کربلا کو عجیب وغریب انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور اسے رنگ برنگ روایات سے اس قدر مزین کیا گیا کہ وہ واقعہ ہونے کے باوجود افسانہ بن گیا اور دنیا کے لیے اس کی واقعیت اور افسانویت میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ واقعہ کربلا کی رنگ آمیزی نے اس دعوت میں بڑی جان پیدا کی اور اس سے اسے خوب فروغ ہوا۔ ساتھ ہی بنوامیّہ کے ابتدائی کاموں میں بھی خوب خوب رنگ آمیزی کی گئی اور ان کو بھی واقعات سے نکال کر افسانہ بنا دیا گیا۔ ایک طرف حقیقت کو افسانہ بنایا گیا محبت والفت میں اور دوسری طرف عداوت و نفرت میں، بہرحال دونوں طرف سے اصل حقائق کو ختم کرکے مفروضات و مزعومات کی دنیا آباد کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاہل اور عامی مسلمان کربلا کے مظالم اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو نہایت اہمیت کے ساتھ جانتا ہے جبکہ لوگ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ واقعہ حرّہ اور محاصرہ مکہ وغیرہ سے ناواقف ہیں، حالانکہ یہ حوادث کربلا سے کئی درجہ اہم ہیں۔ اسی طرح جاہل اور عامی مسلمان یزید، مروان، ابن زیاد، عمر بن سعد، شمر بن ذی جوشن کو ظالم جابر فاسق کہنے کے لیے تفصیلی معلومات رکھتا ہے، جبکہ فرعون وہامان اور شداد ونمرود کے ظلم وستم کا اجمالی علم بھی کم ہی لوگ رکھتے ہیں، حالانکہ یہ دنیائے انسانیت کے اکابر مجرمین ہیں۔

چونکہ چوتھی صدی ہجری تک تاریخی واقعات بھی احادیث کی طرح اسناد کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے اور تاریخ نویسی کا یہ طریقہ تھا کہ مورخ ہر قسم کے واقعات کو راویوں کی سندوں کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کر دیتا تھا اور اس کی حیثیت صرف جامع کی ہوا کرتی تھی وہ ناقد و مبصر نہیں ہوتا تھا اس لیے مسلمان مورخوں نے کمال دیانت سے ان فتنوں کی تاریخ میں بھی اسی ذمہ داری کو پورا کیا اور جو واقعہ جس سلسلۂ رواۃ سے ملا درج کر دیا۔ ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔ اس کا فیصلہ انہوں نے پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا کہ وہ اسانید رواۃ کی تحقیق اور اپنی بصیرت سے کام لے کر موافق و مخالف روایات کے بارے میں رائے قائم کریں۔ اس دور کے مسلمان مورخوں نے داخلی فتنوں میں پڑنے اور ان کے گذر جانے کے بعد ان میں فریق بننے سے گریز کیا، اور بعد والوں نے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق ان کے مندرجات سے استدلال کیا۔ چنانچہ آج تک ان فتنوں کے بارے میں ان ہی قدماء کی کتابیں موافقین و مخالفین کا ماخذ بنتی چلی آئی ہیں اور جوں جوں اپنے اسلاف سے بیزاری پیدا ہوجاتی ہے ان کے بارے میں لوگوں کی زبانیں کھلتی جاتی ہیں، بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ محدثین پر بھی مورخون کی طرح حکومت وقت سے ڈرنے اور اس کی تائید کرنے کا الزام رکھا جانے لگا ہے اور ان کو کذاب و مفتری اور شیعہ و خوارج کہا جانے لگا ہے، اور ان کی شدتِ احتیاط اور باادب سکوت ان کا سب سے بڑا جرم قرار پا رہا ہے۔

اب سے پہلے اسلامی تواریخ کے مطالعہ میں اسلامی ذہن و فکر کی رہنمائی ہوا کرتی تھی۔ واقعات کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا اور ان کی تحقیق و تفتیش میں ان کے ظروف و احوال، اسناد و رواۃ اور اصول و فروع پر ایمان و دیانت کے نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا تھا۔ مگر اب اسلامی تاریخ کو وطنیت و قومیت کے معیار پر جانچا جانے لگا ہے اور اس کے مطالعہ میں نسلی و وطنی محرکات کام کرنے لگے ہیں، اس لئے ہر وہ واقعہ جو وطنیت و قومیت کے نظریہ کے خلاف ہو غلط اور بے اصل ہے اور اس کے لکھنے والے کذاب و مفتری ہیں۔ اس سے بحث مطلق نہیں کہ اس میں واقعیت کہاں تک ہے۔ جذباتیت کی اس رو نے آج مسلمان مولفین و مصنفین کے ایک طبقہ کو بری طرح سطحیت پسند بنا دیا ہے اور ان کے لیے بہت آسان ہو گیا ہے کہ وہ مسلمہ واقعات و شخصیات کا کھلے بندوں انکار کر دیں اور اپنے ذہن کے موافق جو چاہیں لکھ دیں۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کو لے لیجئے، جن کا خاص مضمون ادبیات ہے مگر ''عروبت'' کی ہوا نے ان کو اسلامی تاریخ و رجال کا محقق بنا دیا اور انہوں نے مصریوں سے قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کا عار دھونے کے لیے عبد اللہ بن سبا (ابن

السوداء) کے وجود ہی کا انکار کر دیا، اور اسے ایک افسانوی شخصیت قرار دینے کی کوشش کی۔ اسی طرح انہوں نے ابن ابی سلول منافق کے وجود کا انکار کرتے ہوئے اسے افسانہ بنانے کی کوشش کی، نیز اسلامی واقعات کو عروبت کے نقطۂ نظر کے مطابق بنانے کی روش اختیار کی۔ اس ذہنیت کو معلوم کرنے کے لیے ان کی کتابوں کا مطالعہ کافی ہے۔

عرب ممالک کے نئے ذہنوں کو ''عروبت'' نے یہاں تک جراءت مندی عطا کر دی کہ وہ زمانہ جاہلیت کے ان تمام واقعات وحالات کو مورخین ومفسرین اور محدثین کی غلط بیانی قرار دینے لگے ہیں، جن میں جاہل عربوں کے اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور دینی وفکری انحطاط کو اجاگر کیا گیا ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے یہ اسلاف ہماری قدیم تہذیب وفکر کے علمبردار تھے اور ہمیں ان پر فخر کرنا چاہیے۔ غرض کہ ان دنوں عرب ممالک میں نیشنلزم کی تحریک اپنے عروج پر ہے۔ ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کی یادگاریں قائم کرنے کی تجویزیں عربی مجلّات وجرائد تک میں آچکی ہیں۔

''عروبت'' کے علمبرداروں کے خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی تاریخ کے ایک ہیرو تھے اور مخالفین روساء قریش رجعت پسند فکر کے نمائندے مخالف پارٹی کی حیثیت سے تھے اور ابوجہل وابولہب وغیرہ نے اپنے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں جو پارٹ ادا کیا ہے وہ سلمان فارسی، بلال حبشی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم جیسے غیر ملکی عناصر سے زیادہ عظمت وتوقیر کا مستحق ہے اور ہمیں اپنی عروبت کی تاریخ پر فخر کرتے ہوئے اپنے تمام ہیروؤں کا اعزاز واحترام کرنا چاہیے اور دور جاہلیت میں جو عروبت خالصہ کا بہترین ترجمان تھا، اس کے بارے میں جو خرابیاں بیان کی گئی ہیں وہ سراسر اتہام اور بہتان ہیں۔

عروبت کے انتہاء پسند رجحان کے دور میں اموی دور حکومت وخلافت پر فخر قدرتی امر ہے، جو حجاز کے دو قبائل مضر اور ربیعہ میں سے قبیلہ مضر کا بہترین کارنامہ ہے، اور جس کی بنیاد خلافت راشدہ کے دینی افکار ونظریات سے ہٹ کر ''عصبیت مضر'' پر رکھی گئی تھی۔ اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے دور میں بہترین کارنامے انجام دیئے اور مشرق ومغرب پر کامیاب حکومت کی۔ اسی نظریہ کی بناء پر آج حجاج بن یوسف بھی عروبت کی عظیم الشان شخصیت بنا دیا گیا ہے اور اس کے تمام کارناموں کو اس لیے حق بجانب تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس نے تنہا خالص عربی حکومت کے قیام واستحکام میں وہ کام کیے جو بڑی بڑی جماعتوں اور پارٹیوں سے نہیں ہو سکتے تھے، اسی طرح آج کے دور میں مروان، یزید، ابن زیاد وغیرہ دولتِ عربیہ خالصہ کے اولیں معماروں میں تسلیم کیے جاتے ہیں اور ان کے کارناموں کو استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ جب آج قومیت ووطنیت پرستی نے فراعنہ مصر کو مصریوں کی تہذیب کا مورث اعلیٰ بنا

کران کو قابلِ فخر شخصیت قرار دے دیا ہے اور چنگیز و ہلاکو جیسے پوری دنیائے انسانیت کے سفاک و ظالم اپنی اپنی قوموں کے ہیرو اور قابلِ فخر و احترام شخصیت بن گئے ہیں، تو ان کے خیالات و رجحانات میں اموی حکمران اور ان کے حمایتی قابلِ فخر و احترام کیوں نہ قرار پائیں، جبکہ چند خطرناک قسم کی غلطیوں کے بعد وہ مجموعی اعتبار سے بہترین حکمران تھے اور دنیا نے ان سے بہت کچھ پایا اور انہوں نے انسانی تاریخ میں پروقار مقام چھوڑا ہے، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو کچھ کر دیا اس میں ان کو سابقیت کی افضلیت حاصل ہے اور بعد کی کوئی حکومت اس معاملہ میں ان کی ہمسر نہیں ہو سکی۔ ان حالات میں شدید ضرورت ہے اموی دورِ خلافت اور اس کے حکمرانوں کے بارے میں بڑی ذمہ داری اور احتیاط سے تحقیق کی جائے۔ اور مخالفین کے الزامات اور موافقین کے مبالغات سے ہٹ کر اصل حقیقت کو سامنے لایا جائے اور اس اہم کام کو مسلمانوں کا کوئی ذمہ دار علمی و تحقیقی ادارہ پورا کرے اور بالغ نظر مورخ و ناقد صحیح فکر سے کام لے کر مسلمانوں کے سامنے اپنی تحقیقات پیش کریں۔

سرسری جائزہ

(کتاب ’’خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید اور مؤلف محمود احمد عباسی) اس کے مؤلف مولانا محمود احمد عباسی ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ کراچی میں چھپی اور وہیں سے شائع ہوئی تھی، اس کے ٹائٹل پر یوں تعارف درج ہے۔

’’اموی خلافت کا پس منظر۔ سیرۃ معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید بن معاویہ، حادثۂ کربلا و فتنۂ حرّہ پر بے لاگ تحقیق و ریسرچ‘‘۔

کتاب ’’خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید‘‘ نہ عقائد کی کتاب ہے کہ اس پر علم کلام اور اعتقادیات کی رو سے بحث کی جائے، نہ سراسر تاریخی اور علمی کتاب ہے کہ اسے اس نقطہ نظر سے پرکھا جائے اور نہ ہی بالکل مناظرہ و مجادلہ کے رنگ میں لکھی گئی ہے کہ پھر بحث و مناظرہ کی روش اختیار کی جائے، بلکہ یہ کتاب چند ایسے مضامین کو مجموعہ ہے جن میں نہ واقعات کی ترتیب کا لحاظ ہے نہ استدلالات کا کوئی خاص رخ ہے اور نہ ہی واقعات و حقائق کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تشاجرات و مناقشات اور دوسرے واقعات کو ایک خاص ذہن و فکر اور ایک مخصوص نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کتاب میں بڑی حد تک اس روشن خیالی عالی ظرفی اور آزاد روی کا رنگ موجود ہے جو آج کل تحقیق اور ریسرچ کے نام پر ظاہر کیا جاتا ہے جس میں نہ اسلاف کا لحاظ ہوتا ہے نہ مسلمات کی عظمت تسلیم کی جاتی ہے، نہ اپنے علمی و فکری سرمایہ کو اصلی حالت میں استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، بلکہ روشن

خیالی کے زعم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اپنی مخصوص رائے ظاہر کی جاتی ہے، علمائے اسلام اور محدثین و متکلمین کی مساعی پر حرف گیری کی جاتی ہے اور قرآن و حدیث کے معانی و مطالب کو اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور تاریخی حقائق کو اپنے موافق بنانے کے لیے واقعات کو توڑ امروڑا جاتا ہے اور نہایت بے اصولی اور سطحیت کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔

اس کتاب کی حیثیت بالکل وہی ہے جو آزاد خیال اور منکرین حدیث کی کتابوں کی ہے۔ اس کتاب کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے اس قسم کی دوسری عامی اور سطحی کتابوں کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ کتاب ایک ایسی کتاب پر تبصرہ اور اس کے جواب کے طور پر لکھی گئی ہے جو ''الحسین'' کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ابوالنصر نے روشن خیالی اور تجددیت کا اظہار کیا ہے اور ایک خاص نقطہ نظر اور محور فکر متعین کر کے اس پر واقعات ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کتاب پر تبصرہ اور اس کے جواب میں سطحیت کا آنا بعید نہیں بلکہ قرین قیاس ہے خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ مبصر پہلے سے اپنے ذہن و دماغ پر غلط باتوں اور بے جا پروپیگنڈہ کا بے پناہ بار محسوس کر رہا ہو اور اس کی طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی ہو، یا وہ خاص حالات اور خاص تقاضوں کی بنا پر یہ محسوس کرنے لگے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یزید اور بنوامیّہ کے بارے میں قرنہا قرن سے ایک جماعت بہتان و افترا کی روش اختیار کئے ہوئے ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومیت کا نام لے کر اسلام کے اوصاف و محاسن اور رجالِ اسلام کے فضائل و کمالات پر نہ صرف پردہ ڈال رہی ہے بلکہ ان کو نہایت برے رنگ میں پیش کر رہی ہے۔ اور یہ جماعت سیاسی طاقت حاصل کر کے اپنے ہفوات و مزعومات کو پورے عالم اسلام میں حقائق و مسلمات کے رنگ میں پیش کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس قسم کی باتوں کا ردّعمل طبعی طور ایسا ہوتا ہے جس کا اظہار ''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید'' نامی کتاب میں کیا گیا ہے۔

خصوصاً جب لکھنے والے کا ذہن معیاری نہ ہو، اپنے انداز تحریر میں طبعاً آزاد ہو، مسلمات و حقائق میں رنگ آمیزی کرتا ہو، اپنے مقصد کے لیے قدیم تاریخی سرمایہ کو بے اصل قرار دے کر اس سے بعد کی لکھی ہوئی کتابوں کو اسی طرح معتبر و مستند سمجھے کہ اپنے مقصد کی بات ان سے لے لے اور جو تصریحات اس کے نقطہ نظر کے خلاف پڑتی ہوں ان کو چھوڑ دے اور جن کتابوں کو غیر معتبر قرار دیتا ہو ان سے اپنے مطلب کے موقع پر بڑے حوصلے سے استدلال کرے اور جو کتابیں واقعی معتبر ہیں ان سے خاموشی اختیار کر کے بلا تکلف اپنا مقصد پورا کرتا ہو، اس کے انکارِ حدیث میں صرف اس

کے فکری محرکات کام کرتے ہوں اور رواۃ حدیث و رجال پر جرح و تنقید کرنے میں اس کا خاص مطلب کام کرتا ہو۔ مسلمہ شخصیتوں کی کتابوں سے اپنے ذوق کے مطابق ان کے جزوی مباحث کو اس طرح نقل کر دیتا ہو جیسے یہی باتیں ان کے مسلک کی ہیں۔

ظاہر جو شخص اس طریقے سے کوئی مقالہ یا کتاب لکھے گا اس میں اس کی وہی باتیں ہوں گی جن کو اس نے پہلے سے اپنا مطمح نظر بنا رکھا ہے وہ ان کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا۔

اس لیے ”خلافت معاویہ ؓ و یزید“ نامی کتاب میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مجموعی حیثیت سے صرف مؤلف کے ہیں۔ ان میں نہ براہ راست کسی خاص مکتب خیال اور جماعت کی ترجمانی ہے اور نہ براہ راست کسی خاص فرقہ اور مسلک کی مخالفت ہے۔ اس کتاب میں نہ اہل سنت والجماعت کے صحیح موقف کی وضاحت ہے اور نہ شیعوں کی مخالفت ہے اور مجموعی طور پر ایک خاص شخص کے خیالات کی ترجمانی ہے۔

مؤلف کی یہ کوشش بہت محمود و مشکور ہوتی اگر وہ معاویہ ؓ یزید اور بنو امیہ کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کا پول کھولتے اور تاریخ کے خزانوں کو کھنگال کر ان کے مناقب و فضائل اور محاسن و کمالات کو یکجا کرتے اور امت کے سامنے اس سیاہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے جسے زمانہ دراز سے شیعوں اور شیعی ذہن سنیوں نے اپنے رنگ سے پر کیا ہے۔ اس سلسلہ کی ادنیٰ کوشش کو بھی مع لغزشوں کے سراہتے کیونکہ یہ کام کرنے کا ہے اور اس کی سخت ضرورت ہے۔

مگر افسوس کہ مؤلف نے اپنے آپ کو اس جادۂ مستقیم پر نہیں رکھا، بلکہ بڑی دلیری اور بے باکی سے سیدنا علی، سیدنا حسن، سیدنا حسین اور سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو جگہ جگہ گرا کر سیدنا معاویہ ؓ، اور یزید اور بنو امیّہ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ اور ان حضرات کو سب کچھ بنا دیا ہے جو احادیثِ صحیحہ، واقعاتِ معتبرہ اور حقائق مسلمہ کے سراسر خلاف ہے۔

اسلامی تاریخ اور ائمۂ علم و فن پر افترا

محمود احمد عباسی نے سب سے پہلا اور سب سے شاندار جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ ہے اسلامی تاریخ کے تمام نئے پرانے سرمایہ کو بے اصل، جعلی اور کذب و افتراء کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ اور اس کے ثبوت کے لیے ایک ولندیزی مستشرق ”دے خوے“ کو سب سے بڑا اسہارا بنایا ہے۔ آپ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اموی دور کے تقریباً ایک صدی بعد سے جو مخصوص کتب حروف داخلیہ کے بارے میں تالیف ہوئیں ان کے مؤلفین نے جو کلیۃً خاص ذہنیت کے حامل تھے، نیز مورخینِ سابقین نے اس عہد کے حالات قلم بند کرنے میں نہ صرف بخل و ناانصافی سے کام لیا ہے بلکہ خاص خاص واقعات کو وضعی روایات کی بناء پر اس درجہ مسخ کر کے پیش کیا کہ دے خوے جیسے آزاد و بے لاگ محقق کو کہنا پڑا کہ الخ''۔ (ص:٦)

پھر آپ نے بعد کے تمام تاریخی سرمایہ کو بے اصل اور ناقابل اعتبار قرار دیتے ہوئے کہا:

''کذب بیانیوں کی یہ حالت الا ماشاء اللہ برابر قائم رہی، صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں۔ نامور سے نامور مورخ عہد بہ عہد پیدا ہوتے رہے۔ مگر بقول ''دے خوے'' سچ کو جھوٹ سے تمیز کرنے یا وضعی روایتوں اور مبالغات کو کتب تاریخ میں مذکور ہیں نقد و روایات سے جانچنے کی کوشش سوائے علامہ ابن خلدون کے کسی اور مورخ نے نہیں کی۔ خصوصاً ابتدائی دورِ اموی کے بعض مشہور واقعات کے اغلاق و مبالغات کے بارے میں روایت پرستی کی اس زمانہ میں ایسی وبا پھیلی کہ متاخرین بیشتر اپنے پیش رو مورخین سے نقل در نقل کرنے پر اکتفاء کرتے رہے''۔ (ص:۷)

آپ نے ایک کتاب تالیف کرنے کا ارادہ کیا فرمایا کہ اسلام کے پورے دور کی تاریخ پر سیاہی پھیر دی۔ اور تمام مورخوں کو اپنی تحقیق کے سامنے روایت پرست، جعل ساز، کاذب مفتری اور غیر معتبر قرار دے دیا۔ اور آپ کے نزدیک اسلامی مورخوں سوائے علامہ ابن خلدون اور کچھ امام ابن تیمیہ اور امام غزالی اور بعض دیگر ائمہ کے سب کے سب جھوٹے اور کذاب ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ اپنی کتاب کے لیے اتنا بڑا کام نہ کرتے۔ اب ذرا دیکھئے اپنے کو ناقد بنانے کے لیے آپ نے کیسے کیسے ائمہ علم و فن اور محدثین و مورخین کو بگاڑنے کی سعی فرمائی ہے اور آپ کی تحقیقی مار کہاں کہاں تک پہنچی ہے۔ محمود احمد عباسی لکھتے ہیں:

''تاریخ کا منشا روایات کا انبار لگانا نہیں ہے اور نہ یہ جو طبری، واقدی، مسعودی اور سیوطی وغیرہ نے اختیار کیا ہے کہ جو روایت جہاں سے ملی ٹانک دی''۔ (ص:۴۴)

آگے چل کر فرماتے ہیں:

یہ ابو مخنف لوط بن یحیٰی، یہ محمد بن سائب کلبی اور اس کا بیٹا ہشام اور اسی قماش کے دوسرے مفتری اور کذاب لوگوں نے ہماری تاریخ کو مسخ کر دیا اور طبری جیسے لوگوں نے اپنے دلوں کی بیماری کو پوشیدہ رکھ کر ان مفتریوں اور کذابوں کا تمام

سرمایہ امت کو گمراہ کرنے کے لیے جمع کر دیا۔ اور جو لوگ شیخ جلال الدین سیوطی کی طرح حاطب اللیل ہیں، یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں جمع کرنے والے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کام کی لکڑی آئی یا بیکار وزہریلی، انہوں نے ''تاریخ الخلفاء'' جیسی کتابیں لکھ کر اخلاف کو اسلاف سے بدظن کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔ اور یوں اکثر لوگوں کے فکر ونظر پر مکذوبہ روایتوں کے پردے پڑتے گئے''۔ (ص: ۴۷)

امام ابن جریر طبری کو دو جگہ کذاب ومفتری اور مریض قلب قرار دینے سے تسلی نہیں ہوئی تو مزید لکھا:

''ابن جریر طبری علامہ وقت تھے، لیکن روایت پرستی کی بناء پر یا اپنے خاص مسلک کی وجہ سے ابومخنف کی کتاب کا شاید کل مواد بغیر کسی تنقید کے داخل کر دیا اور طبری سے اس کے بعد آنے والے مورخین نے''۔ (ص: ۲۳۹)

مزید فرماتے ہیں:

''سانحہ کربلا کے اولین راوی ومؤلف کتاب ''مقتل حسین بن علی رضی اللہ عنہما'' نے بیان کیا اور قدیم مورخین خاص کر طبری نے بغیر کسی تنقید کے اس طور سے نقل کر دیا ہے جس ''نقل راچہ عقل'' کی مثال صادق آتی ہے''۔ (ص: ۱۱۸-۱۱۹)

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کو بار بار غالیوں، کذابوں اور مفتریوں کے زمرے میں شمار کیا ہے، مگر آگے چل کر بڑی جسارت سے ان کو کھل کر شیعی مورخ بنا دیا۔ ملاحظہ ہو:

''طبری جیسے شیعی مورخ کا بھی یہ بیان ہے''۔ (ص: ۲۷)

اس کے بعد ہے کہ:

''شیعی مورخ طبری نے بھی امیر یزید کے امیر الحج ہونے کا تذکرہ کیا ہے''۔ (ص: ۳۰)

ایک جگہ لکھا ہے:

''طبری جیسے شیعی مورخ نے بھی لکھا ہے کہ الخ''۔ (ص: ۲۳۴)

ایک اور جگہ ہے:

''اس قطعہ اشعار کو شیعہ مورخ طبری نے بھی درج کیا ہے''، (ص: ۴۷)

''خلافت معاویہ ویزید'' کے مولف محمود احمد عباسی نے امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ صاحب ''تفسیر ابن کثیر'' اور صاحب ''البدایہ

والنہایہ'' کو بھی نہیں بخشا اور ان کو بھی ان ہی ائمہ دین کے زمرے میں لانے کی کوشش کی ہے جن کو کذاب ومفتری اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ایک اور علامہ وقت، مورخ ومحدث ابن کثیر کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو''۔ جنہوں نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا ہے کہ ابو مخنف کی روایتیں قابل اعتبار نہیں، لیکن ابن جریر جیسے ائمہ نے چونکہ ان کو درج کر دیا ہے، اس لیے ہم بھی نقل کیے دیتے ہیں''۔ (ص: ۱۴۳)

محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب میں جس جرأت وبہادری کا ثبوت دیا ہے اس کا تقاضا تھا کہ پہلے اسلامی تاریخ وروایت کا قصر معلّیٰ مسمار کر دیا جائے اور اس کے جتنے ستون ہیں ان کو ایک ایک کر کے گرا دیا جائے پھر اس کے ملبے پر یہ نئی بنیاد ڈالی جائے۔ اسی جرأت مندی نے ابو مخنف، محمد بن سائب کلبی، ہشام کلبی کے ساتھ ساتھ امام، محدث، فقیہ، مورخ، مفسر، ابن جریر طبری جیسے عظیم المرتبت مسلم امام اسلام کی شان میں گستاخی کی۔ امام مسعودی جیسے ثقہ اور مسلم مورخ کو مجروح قرار دیا اور امام حدیث اور مفسر ومورخ امام ابن کثیر دمشقی پر کیچڑ اچھالی اور جلال الدین سیوطی کو حاطب اللیل لکھا۔

آپ جیسے صرف ایک ہی مورخ ومحقق کے لیے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ اپنی اس کتاب کا اکثر وبیشتر حصہ آپ امام طبری کی تاریخ اور امام ابن کثیر کی تاریخ البدایہ والنہایہ، علامہ مسعودی کی تنبیہ الاشراف وغیرہ سے مرتب کریں اور اپنے مطلب کی تمام روایات کا بلا تکلف نقل کریں اور جہاں آپ کے مطلب کی بات نہ ملے یا آپ کے مزموعات سے ٹکراؤ ہو وہاں ان بزرگوں کو ''غالی مصنف'' کذاب ومفتری وشیعہ قرار دیں، اگر یہ کتابیں بقول آپ کے کذب وافتراء سے پر ہیں اور ان کے مصنفین ''کذاب ومفتری شیعہ'' ہیں تو آپ کو صرف علامہ ابن خلدون، امام ابن تیمیہ اور امام غزالی نیز ان جیسے بعض دیگر ائمہ کی کتابوں سے کام چلانا چاہیے تھا، کیا مزے کی بات ہے کہ ان ائمہ علم وفن کو آپ بری طرح مجروح بھی کرتے ہیں اور پھر ان ہی سے استدلال کر کے ان کی توثیق بھی فرماتے ہیں۔ البتہ جہاں آپ کا مفروضہ بگڑنے لگتا ہے وہاں ان بزرگوں پر مزید افتراء پردازی کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ بعض جگہ آپ خاص طور سے ان بزرگوں کی تصدیق وتوثیق فرماتے ہیں، مثلاً:

''مورخ ابی الحسن بن مسعودی متوفی ۳۴۶ ہجری جن کی دو تالیفات ''مروج الذہب اور ''تنبیہہ'' باقی ہیں۔ بڑے پایہ کے مورخ اور امام فن تھے''۔ (حاشیہ ص: ۳، ۲)

آپ ان ہی امام مسعودی کو صفحہ ۴۴ پر غیر معتبر قرار دے چکے ہیں، اب یہاں پر یہی بڑے پایہ کے مورخ اور امام فن کیسے بتائے گئے؟

پھر اس سلسلہ میں مزید پر لطف بات یہ ہے کہ جن علامہ ابن خلدون کو آپ اسلام کا پہلا حقیقی مورخ گردانتے ہیں اور ان کی تقلید پر آپ کو پورا اطمینان ہے وہ ان بزرگوں کو فنِ تاریخ میں ’’امامت معتبرہ‘‘ اور فضیلت شہرت کا مالک قرار دیتے ہیں، مگر آپ نے خیانت کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون کی اس تصریح کو پیش نہیں کیا اور اسی سے متصل عبارت کو اپنے مطلب کے مطابق نقل کر کے خاموش ہو گئے۔ قارئین کرام علامہ ابن خلدون کی تصریح ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ موصوف غیر معتبر راویوں اور مورخوں کی حالت بیان کرنے کے بعد معاً فرماتے ہیں:

’’اور جو لوگ شہرت کی فضیلت اور امامت معتبرہ کے وارث ہوئے اور انہوں نے اپنے پہلے لوگوں کی کتابوں کو اپنی پچھلی تصنیفات میں جمع کیا، وہ تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہیں۔ جیسے محمد بن اسحاق، طبری، محمد بن سائب کلبی، محمد عمر الواقدی وسیف بن عمر الاسدی/ التمیمی، المسعودی اور دوسرے مشاہیر جو جمہور مورخین سے ممتاز ہیں۔ اگرچہ مسعودی اور واقدی کی کتابوں میں طعن و تعریض کی ایسی باتیں ہیں جو ثقہ لوگوں کو معلوم ہیں اور حفاظ و ثقات میں مشہور ہیں اس کے باوجود کافہ اہل علم ان کی روایات و اخبار کو خاص طور پر قبول کیا ہے‘‘۔ (مقدمہ ابن خلدون ص: ۳)

اگر علامہ ابنِ خلدون پر آپ کو اعتماد ہے جیسا کہ آپ بار بار اس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں تو پھر آپ کو کم از کم طبری، محمد بن سائب کلبی اور مسعودی کو معتمد اور ثقہ مورخ ماننا چاہیے، جب علامہ ابن خلدون جیسے تاریخی ناقد و مبصر نے ان بزرگوں کو فن تاریخ میں ’’شہرت کی فضیلت‘‘ اور معتبر امامت و سیادت کی سند دی ہے تو آپ کو ان پر اعتماد کر لینا چاہیے، جیسا کہ امام ابن کثیر نے ’’البدایہ والنہایہ‘‘ میں امام طبری وغیرہ وغیرہ کی امامت و سیادت کا احترام کرتے ہوئے ان کی روایات کو درج کیا ہے اور آپ نے خود ہی کتاب کے صفحہ ۷ پر ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

[ولو لا ابن جرير وغيره من الحفاظ والائمة ذكروا ما سقته]

’’اور اگر ابن جریر طبری وغیرہ جیسے حفاظ حدیث وائمہ تاریخ اس کو ذکر نہ کرتے تو میں بھی اسے بیان نہ کرتا‘‘ (البدایہ والنہایہ ۲۰۳/ ۸)

مگر آپ جیسا جری ناقد و مبصران بزرگوں پر اعتماد کرنے میں علامہ ابن خلدون کی بات کو تسلیم کیا کرے گا، آپ تو امام

ابن کثیر پر اس لیے طعن و تشنیع کر رہے ہیں کہ انہوں نے آئمہ تاریخ اور حفاظ حدیث کی روایتوں پر اعتماد کیا ہے۔ ملاحظہ ہو (ص: ۱۲۲) مؤلف نے علامہ ابن خلدون کی امامت وثقاہت واضح فرماتے ہوئے بڑی دل سوزی سے اس امر کا اظہار کیا ہے:

’’تنہا وہی ایک مورخ ہیں جنہوں نے دیگر وضعی روایات کی طرح سانحہ کربلا کی موضوعات کو اس معیار سے جانچنے کی کوشش کی تھی جس کی پاداش میں ان کی کتاب کے تمام نسخوں سے صرف یہی تین ورق (یعنی چھ صفحے) جو اس حادثہ کے بارے میں تھے ایسے غائب ہوئے کہ آج تک کسی فرد بشر کو چار دانگِ عالم میں دستیاب نہ ہو سکے‘‘۔ (عرض محمود احمد عباسی ص:۸)

ان تین ورقوں کے غائب ہونے کا علم غالباً آپ کو ترجمہ تاریخ ابن خلدون کے مترجم کی تصریح سے ہوا ہے جیسا کہ انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے:

’’اس مقام سے مضمون تاریخ کامل ابن اثیر جلد چہارم اور تاریخ الخلفاء ومعارف ابن قتیبہ وعقد الفرید وغیرہا سے اخذ کیا گیا ہے۔ اصل کتاب میں تین ورق سادہ ہیں‘‘۔ مترجم (حاشیہ تاریخ ابن خلدون ۵/۷۷)

اس کے بعد مترجم نے صفحہ ۷۷ اور صفحہ ۱۷۲ تک اضافہ کیا ہے۔ غالباً مؤلف نے اس کتاب کے اسی جلد میں صفحہ ۴۳ پر بھی ’’یزید کی ولی عہدہ کے سلسلے میں مترجم کا یہ حاشیہ بھی دیکھا ہوگا:

’’اصل کتاب میں اس مقام پر خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ شارحین کی عبارت میں نے تاریخ کامل ابن اثیر ۷☼۳۵۳ سے ترجمہ کر کے لکھی ہے‘‘۔ (حاشیہ ص: ۴۳)

اس کے بعد مترجم نے صفحہ ۴۳ سے صفحہ ۵۰ تک اضافہ کیا ہے۔ نیز اس جلد میں صفحہ ۱۰ پر اصل کتاب میں جگہ چھوٹی تھی، مترجم نے اسے پر کیا ہے، اسی طرح صفحہ ۳۸ پر اصل جگہ خالی تھی اور مترجم نے ’’مروج الذہب‘‘ سے اضافہ کیا ہے۔ اسی جلد میں صفحہ ۵۴ پر بیاض تھی جسے مترجم نے پر کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون نے اپنی بے نظیر تاریخ میں بعض مقامات پر بیاض چھوڑ دی تھی۔ اس خیال سے کہ اس جگہ کو تحقیق وتلاش کے بعد پر کر دیا جائے گا مگر وہ جگہ پر نہ ہو سکی، یہاں تک کہ ۸۰۸ ہجری میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی تاریخ کے تمام نسخوں میں ان جگہوں پر بیاض ہی رہ گئی۔ جیسا کہ بہت سی کتابوں میں بیاض ہوتی ہے اور

طبع کرتے وقت کچھ جگہ چھوڑ کر حاشیہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ ''فی الاصل بیاض'' یہ سمجھنا بڑی نادانی ہے کہ تاریخ ابن خلدون کے دنیا بھر کے نسخوں سے اوراق غائب کر دیے گئے۔ علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ لکھنے کے بعد مشرق کا سفر کیا۔ اور حج وزیارت ادا کرنے کے بعد مشرق کے ملوک عجم اور ترک ممالک کے حالات کو اپنی کتاب میں درج کیا۔ مقدمہ میں فرماتے ہیں:

[ثم كانت الرحلة الى المشرق (الى ان قال) فزدت ما نقص من اخبار ملوك العجم بتلك الديار و دول الترك فيما ملكوه من الاقطار واتبعت بها ما كتبته فى تلك الاسطار الخ] (مقدمه ص : ٥)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ ابن خلدون نے تاریخ مرتب کرنے کے بعد مشرق کے ممالک کا سفر کیا اور اس کے بعد کتاب میں جگہ جگہ اضافہ کیا۔ کتاب میں اضافہ کرنے کے بعد اس کا ایک نسخہ علامہ ابن خلدون نے سلطان مغرب امیر المومنین ابو فارس عبدالعزیز مرینی کے کتب خانہ میں ہدیۃً پیش کیا۔ یہ کتب خانہ سلاطین بنی مرین کی طرف سے شہر فاس کی جامع قزوین میں طلبہ پر وقف تھا۔

[اتحفت بهذه نسخة منه خزانة مولانا السلطان (الى ان قال) وبعثت الى خزانتهم الموقفة لطلبه العلم بجامع القزوين من مدينة فارس حضرة ملكهم وكرسى سلطانهم الخ] (مقدمه ص : ٦)

اس مقام پر حاشیہ میں ہے کہ ایک مغربی نسخہ کی عبارت میں زیادتی ہے جس میں ہے کہ میں اس کتاب کو امیر المومنین ابو یحیی ابو بکر (موحدین) کی خدمت میں پیش کیا اور یہ مغربی نسخہ ابو فارس کے کتب خانے والے نسخے سے مختصر ہے۔ (حاشیہ ص:٦٧٧)

ان باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تاریخ ابن خلدون میں خود مصنف نے کچھ مقامات خالی چھوڑے تھے اور بعد میں اضافے کئے اور اس کا ایک نسخہ سلطان فارس کے طلبہ کے لیے وقف تھا، نیز اس کا ایک نسخہ سلاطین موحدین میں سے سلطان ابو بکر کی خدمت میں پیش کیا اور اس کے بے نسخوں میں بعض مقامات پر عبارتوں میں کمی زیادتی پائی جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی نسخے سے کوئی حصہ نکال دیا ہوتا تو دوسرے نسخوں میں اس جگہ وہ عبارت ضرور ہوتی۔

واقعہ یہ ہے کہ تاریخ ابن خلدون کے بیاضات خود علامہ ابن خلدون کے ہیں۔ اور علامہ ان کو اپنی زندگی میں یا فرصت نہ پانے کی وجہ سے یا تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے ان کو پر نہ کر سکے۔

ایک طرف تو آپ سیدنا علی اور سیدنا حسین اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور ان کے متعلقین کے معاذ اللہ مثالب و معائب ثابت کرنے کے لیے بڑے بڑے اساطینِ علم وفن کو بری طرح مجروح قرار دے رہے ہیں، اور دوسری طرف یزید اور اس کے طرفداروں کے مناقب وفضائل کو اجاگر کرنے کے لیے گری پڑی بے اصل مجہول اور غیر معتبر کتابوں سے اور ان کے مصنفوں سے بری طرح استفادہ کررہے ہیں۔ یہ کون سی تحقیق ہے اور اس کا مطلب کیا لیا جائے گا؟

اس سلسلہ میں چند کتابوں کی نشان دہی بہت ضروری ہے۔ ''الامامۃ والسیاسۃ'' کے متعلق آپ کا ارشاد بجا ہے کہ ''الامامۃ والسیاسۃ جیسی کتاب میں جو کہ غالی مؤلف نے شرارت سے امام الفقیہ ابی عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری متوفیٰ ۲۷۶ ہجری سے محض غلط منسوب کردی ہے''۔ (ص:۱۵)

پھر اس لغو بے اصل اور غیر معتبر کتاب سے آپ جگہ جگہ ''غالی مؤلف'' کہہ کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ کیا ایک محقق کے لیے کسی طرح اس کتاب کو دلیل میں لانا کسی حیثیت سے جائز ہے؟ جبکہ اس کے اندر نہایت بے سروپا باتیں درج ہیں اور واقعی یہ امام ابن قتیبہ کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کے مصنف نے ان لوگوں سے استفادہ کیا ہے جو فتح اندلس ۹۲ ہجری میں موجود تھے۔ اور یہ کہ موسیٰ بن نصیر نے ہارون رشید کے زمانے میں مراکش کی جنگ کی، حالانکہ ابن قتیبہ کا انتقال ۲۷۶ ہجری میں ہوا۔ اور مراکش شہر ۴۵۴ ہجری میں سلطانِ مرابطین یوسف بن تاشفین کے زمانے میں آباد کیا گیا۔

''الامامۃ والسیاسۃ'' میں جب اس قسم کی غلط باتیں درج ہیں تو پھر اس سے استناد کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ خصوصاً آپ جیسے مورخ وناقد کے لیے جو امام طبری ومسعودی وابن کثیر وغیرہ تک کو غیر معتمد، کذاب ومفتری قرار دیتا ہے۔

آپ نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب ''الاغانی'' سے استفادہ کیا ہے۔ معلوم نہیں ''الاغانی'' جیسی گانے بجانے اور قصہ کہانی کی کتاب کس طرح آپ کے نزدیک معتبر ومستند بن گئی، جبکہ اسے یہ حیثیت کسی طرح حاصل نہ ہونی چاہیے۔ اور امام خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ابوالفرج اصفہانی کو غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ کیا ان کو ''غالی مصنف'' کہہ دینے کے بعد اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

نیز آپ نے جگہ جگہ ''العقد الفرید'' سے بھی استفادہ فرمایا ہے۔ معلوم نہیں محاضرات و مسافرات اور ادبی و علمی غرائب و لطائف کی یہ کتاب آپ کے نزدیک تاریخِ طبری، تاریخ ابن کثیر وغیرہ سے زیادہ معتبر کیسے قرار پائی؟

''کتاب المحبر '' اور اس کے مصنف کو آپ نے اپنے مطالب کے لیے خوب خوب استعمال کیا ہے اور ان کے بارے میں ایک حروف بھی تنقید کا نہیں فرمایا، بلکہ ان کی جگہ ثقاہت و اہمیت کو یوں واضح فرمایا ہے:

''علامہ ابوجعفر محمد بن حبیب الہاشمی متوفی ۲۲۵ ہجری نے اپنی تالیف کتاب المحبر میں'' (ص: ۳۱۷)

اس کے بعد کتاب میں حسب جگہ جگہ اس کتاب سے سند پکڑ کر اسے ثقہ و صحیح مانا ہے، حالانکہ کتاب المحبر کے اندر جگہ جگہ اس کے مصنف کی شیعیت اور رفض نمایاں ہے اور ناشر نے اس کے مقدمہ میں بھی اسے واضح طور سے بیان کر دیا ہے۔ اہل سنت کے بڑے بڑے علماء کو آپ نے غالی مصنف، کذاب و مفتری اس لیے گردانا ہے کہ ان کی تصریحات بعض جگہ آپ کے مفروضہ کے خلاف ہیں۔ اور کتاب المحبر اور اس کے مصنف کو آپ نے سینے سے لگالیا ہے کہ اس میں آپ کے مطلب کی باتیں مل جاتی ہیں۔ کیا آپ جیسے کٹر محقق کے لیے ایسی کتاب کے بارے میں خاموش رہ کر استفادہ کرنا جائز ہے؟

امام قاضی ابوبکر ابن العربی اندلسی مالکی کی کتاب ''العواصم من القواصم'' کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا حوالہ مورخ ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق ''مقدمہ تاریخ'' میں ولایت العہد کی بحث کے سلسلہ میں دیا ہے۔ قاضی موصوف نے اپنی اس تالیف میں ان اکاذیب کی پوری قلعی کھولی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مواقف و مشاہدات کے بارے میں وضع ہوئے۔ (حاشیہ: ۳۰۳)

جو مقدمہ ابن خلدون ہمارے پیش نظر ہے اس کے صفحہ ۱۸۱ پر علامہ ابن خلدون نے اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے، مگر کس موقع پر اور کس طرح؟ اسے بڑی چالاکی سے مؤلف چھپا لے گئے ہیں کے ظاہر کرنے میں ان کا گھروندا بگڑ جاتا۔ اور علامہ ابن خلدون کی تصریح سے جن کو وہ تمام مورخین سے مستند اور ثقہ قرار دیتے ہیں، ان کی کتاب کا سارا مضمون ہی بے کار ہو جاتا۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

''اور قاضی ابوبکر بن عربی مالکی اس بارے میں غلطی پر ہیں۔ اور اپنی کتاب ''العواصم والقواصم'' میں اس مضمون کی بات لکھی ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے نانا کی شریعت کی رو سے قتل ہوئے۔ ابن العربی کو اس غلطی پر امام عادل کی شرط کے

بارے میں غفلت نے ابھارا ہے اور سیدنا حسینؓ کے زمانے میں اہل آراء سے جنگ کرنے کے بارے میں ان سے بڑھ کر اور کون شخص امامت وعدالت کا مستحق ہو سکتا تھا‘‘۔

آپ تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو باغی قرار دے کر ان کے قتل کو ان کی سزا بتا رہے ہیں اور سانحہ کربلا کے معاملہ میں سب سے زیادہ معتبر علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کو مان رہے ہیں اور قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کو بھی معیاری بتاتے ہیں، مگر ابن خلدون کی تصریح کی رو سے امام ابوبکر ابن العربی اس مسئلہ میں غلطی پر تھے، جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے اسے صاف بیان کر کے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے شہید مثاب اور برحق ہونے کی علی الاعلان گواہی دی ہے۔

آپ ان حقائق کو چھپا کر علامہ ابن خلدون اور امام ابوبکر ابن العربی کو اپنا بڑا تسلیم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں بلکہ تدلیس وتزویر ہے۔

آپ نے رعب جمانے کے لیے اپنی کتاب کے ماخذوں کا ذکر کرتے ہوئے اتنی کتابوں کے نام گنوائے ہیں، حالانکہ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان سے کتاب میں شاید ہی کسی جگہ مدد لی گئی ہو۔ مثلاً المنجد کا حوالہ اس کتاب میں بلاوجہ ہے۔ ایک جگہ کربلا کی تحقیق کے سلسلہ میں اس کا نام آیا ہے، اسی طرح مکاتیب شیخ الاسلام مدنی کا ایک غلط حوالہ نقل کر کے اسے بھی ماخذوں میں شمار کرنا رعب جمانے ہی کے لیے ہے۔

اسی طرح بہت سی کتابوں کے نام صرف نام آوری اور پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کے لے درج ہیں۔ تحقیق اور ریسرچ کا مزاج اس طرح کے پروپیگنڈے سے بہت دور ہوتا ہے اور اس سے خرابی ذہن کا پتہ چلتا ہے، نیز آپ جو کتاب میں جگہ جگہ اسلامی مورخوں ہٹ کر دے خوے، ڈوزی، گبن اور دوسرے غیر مسلم مشتشرقین کا نام لیتے ہیں اور ان کی کتابوں اور انسائیکلوپیڈیا کے اقتباسات نقل کرتے ہیں، یہ بھی آپ کی تحقیق کا فیشن ہے اور روشن دماغی کا مظاہرہ ہے۔

کیا لطف کی بات ہے کہ جو شخص اپنے مورخوں اور اماموں کو غلط قرار دیتا ہے وہ یورپ کے متعصب مصنفوں کو حجت مانتا ہے۔ وہ بھی مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے سلسلے میں۔

ہم تاریخی روایات کو اخبار متواترہ اور اخبار صحاح نہیں کہتے بلکہ ان کو قابل نقد سمجھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ بہت سے مورخوں نے اپنے اپنے دور کے حالات کے مطابق تاریخ میں قطع برید کی ہے اور بہت سے واقعات کو ان کے اصل

رنگ میں پیش نہیں کیا۔ اور اس واقعہ کربلا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشاجرات اور بنو امیہ کے موافق ومخالف بیانات بھی بڑی حد تک شامل ہیں۔

مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اسلامی تاریخ ورجال کا سارا ناز خاک میں ملا دیا جائے اور مسلمانوں کے اس شاندار کارنامے کو ملیا میٹ کر دیا، جس پر دنیا کے سارے مذاہب اور تمام اقوام رشک کر رہی ہیں۔

اس کتاب کا اصلی ماخذ

شیخ الاسلام امام تقی الدین احمد بن تیمیہ متوفی ۷۲۸ ہجری کی معرکہ آراء کتاب ''منہاج السنۃ'' چار جلدوں میں مصر میں چھپی ہے۔ آپ کے ایک معاصر شیعہ حسن بن یوسف بن علی بن مطہر حلی متوفیٰ ۷۲۶ ہجری نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کے مطاعن ومثالب میں ایک کتاب لکھی تھی۔ امام صاحب نے نہایت محققانہ انداز میں ابن مطہر حلّی کی کتاب کا ردّ لکھا ہے۔ اور اس کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کتاب میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مناظرانی رنگ پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہیں تحقیقی جواب دیا ہے، کہیں الزامی جواب دیا ہے اور کہیں مخالف کے نظریہ کی بنا پر جواب دیا ہے۔ اس کتاب سے بھی مؤلف کتاب ''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید'' نے بہت غلط طریقہ پر اپنے منشاء کے مطابق اقتباسات لیے ہیں۔

''منہاج السنۃ'' کا مختصر خلاصہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''المنتقیٰ'' کے نام سے لکھا ہے جو مصر کے شیخ محب الدین الخطیب کے حواشی اور مقدمہ کے ساتھ ۱۳۷۴ ہجری میں چھپا ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ انہوں نے نوٹ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے ان ہی حواشی کو مصنف نے اپنی کتاب کا اصل موضوع بنایا ہے اور بغیر نام بتائے اور کسی قسم کی نشان دہی کیئے ان کی تمام کاوش کو اپنی علمی اور تحقیقی کاوش ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جب ہم نے ''المنتقیٰ'' اور اس کے ان حواشی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید'' کے محقق مؤلف نے ان ہی حواشی کا ترجمہ اور چربہ لے لیا ہے۔

ہم ذیل میں چند مباحث کی نشاندہی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کتاب ''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید'' کی خاص خاص باتیں جن کو مؤلف نے اپنی کاوش کا نتیجہ بتایا ہے۔ وہ المنتقیٰ کے ان حواشی میں کہاں کہاں موجود ہیں۔ اور مصنف نے ترجمہ کر کے ان پر اپنا حق ظاہر کیا ہے۔ ان مقامات کو دونوں کتابوں سے نکال کر جس کا دل چاہے ملالے۔

''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید'' کے مؤلف نے صفحہ ۳۴۴ اور صفحہ ۳۴۵ پر سفینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر جو کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب ''المنتقیٰ'' کے حاشیہ صفحہ ۵۷ سے ماخوذ ہے۔

امام ابن تیمیہ نے سفینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ''خلافة النبوة ثلاثون سنة'' کو منہاج السنۃ میں جگہ جگہ بیان کیا ہے، مگر محشّی نے ان کے علی الرغم اس میں کلام کیا ہے اور اسی کو ہمارے مؤلف نے نقل کر دیا ہے۔

صفحہ ۲۲۷ سے ۲۶۲ تک بنوامیّہ اور بنو ہاشم کے درمیان قرابتوں کا بیان ''المنتقیٰ'' کے حاشیہ صفحہ ۱۸۶ اور ۱۸۷ کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت و امارت کے بارے میں مصنف نے جن اقوال وتصریحات کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے ان تمام کا ماخذ ''المنتقیٰ'' کے حواشی صفحہ ۲۷ سے اور صفحہ ۲۳۱ سے ۲۳۴ تک ہیں۔

یزید کی امارت کی اہلیت وقابلیت کے بارے میں مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ''المنتقیٰ'' کے حاشیہ صفحہ ۲۸، ۱۸۱، ۲۰۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴ کا چربہ ہے۔ نیز صفحہ ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵ کے حواشی سے یزید کے فضائل وکمالات کو نقل کیا ہے۔ جن میں کتابوں کے حوالہ جات کے ساتھ یہ تمام باتیں بیان کی گئی ہیں۔

ابومخنف، محمد بن سائب کلبی، ہشام بن محمد کلبی وغیرہ کے بارے میں جو کچھ مصنف نے لکھا ہے اس کا ماخذ بھی ''المنتقیٰ'' کے صفحہ ۲۱ اور ۳۱۸، ۳۱۹ کے حواشی ہیں۔

اس طرح کتاب ''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید'' کی اکثر باتیں ''المنتقیٰ'' کے ان ہی حواشی کا چربہ ہیں۔ نیز اسی محشّی وناشر نے قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی کی کتاب ''العواصم من القواصم'' اسی قسم کے حواشی کے ساتھ شائع کی ہے۔ مصنف نے ان حواشی سے بھی اس کتاب میں پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ان دونوں کتابوں کے ان حواشی پر اپنی تحقیق وریسرچ کی بنیاد رکھ کر دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ آپ نے پہلی مرتبہ ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ''العواصم من القواصم'' کے مباحث اس کتاب کے آخر میں ملاحظہ ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ آپ نے دوسری کتابیں بھی مطالعہ فرمائی ہیں اور ان سے بھی کام لیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کی کاوش کا سارا دارومدار ان ہی حواشی وتعلیقات پر ہے جو ''المنتقیٰ'' اور العواصم'' پر ہیں۔ کیا بہتر ہوتا کہ اس کو ظاہر کرنے کے بعد آپ بھی وہی راہ اختیار کیے ہوتے جسے محشّی نے اختیار کیا ہے اور جوش تحقیق میں افراط وتفریط میں مبتلا نہ ہوئے ہوتے۔

’’المنتقیٰ‘‘، مملکت سعودیہ عربیہ کے نفقہ پر طبع ہوئی ہے۔ اس کے محشّی سلفی ہیں اور حکومت سعودیہ کے علمی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، انہوں نے حواشی میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑی حد تک ایک خاص نقطہ نظر کی ترجمانی کی ہے، پھر بھی انہوں نے سنجیدگی اور علمی و تاریخی حقائق کو برقرار رکھا ہے، اور نہایت فراخ دلی سے بنوامیّہ کے اصل حالات معلوم کرنے کے سلسلے میں ہندی عالم علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ’’النقد علی التمدن الاسلامی‘‘ کی خدمات کو سراہا ہے۔ یہ ضرور ہے کے شیعوں کے جوشِ مخالفت میں انہوں نے بعض بعض مقامات پر علامہ ابن تیمیہ سے بھی دو قدم آگے جانے کی کوشش کی ہے، مگر اس گراوٹ کا کہیں مظاہرہ نہیں کیا جس کا ثبوت مؤلف کتاب ’’خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید‘‘ نے دیا ہے انہوں نے علی، حسن، حسین، ابن زبیر رضی اللہ عنہم پر کسی قسم کی کوئی تعریض نہیں کی ہے اور ان کے بارے میں مسلک اسلاف کو نہیں چھوڑا ہے۔

اگر آپ بھی ایسا کرتے تو ہم آپ کی خدمات کو سراہتے اور ساتھ دینے کی کوشش کرتے۔

جہالت و خیانت اور بد یانتی

غیر زبانوں کے ترجمے میں بڑے بڑے لوگوں سے غلطی ہو جاتی ہے اور ایسا سرزد ہو جانا علمی شان کے منافی نہیں ہے۔ بشرطیکہ ترجمہ جان بوجھ کر کسی خاص مطلب سے غلط نہ کیا جائے۔ اور کسی عبارت سے خوامخواہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس کو تختۂ مشق نہ بنایا جائے۔

افسوس کے کتاب ’’خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید‘‘ کے مؤلف محمود احمد عباسی نے متعدد مقامات پر، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، جان بوجھ کر غلط ترجمہ کیا ہے اور اپنے استدلال میں زور پیدا کرنے کے لیے اس قسم کی بھی کمزوری دکھائی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ایک عبارت کا ترجمہ کس درجہ غلط کیا اور ایک لفظ کی تبدیلی سے کیا سے کیا معنیٰ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ متن اور ترجمہ دونوں کتاب کے صفحہ ۴ سے پیش ہے:

”ہر روز دائرۂ سلطنت او ر لاسیما بعد تحکیم تنگ تر شدن گرفت، تا آنکہ در آخر بجز کوفہ و ما حول آن بدائرے ایشان صافی نماند“

[یعنی۔ ان کی سلطنت کا دائرہ ہر روز خاص کر ثالثی کے بعد زیادہ تنگ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر میں سوائے کوفہ اور اس

کے آس پاس کے اور کچھ ان کے لیے باقی نہ رہا] [1]

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مخالفین کی وجہ سے تحکیم کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں فضا عام طور سے ناساز گار ہو گئی اور صرف کوفہ اور اس کے آس پاس کی فضا ان کے حق میں صاف رہی اور مکدر نہیں ہوئی'' مگر مصنف نے ترجمہ فرمایا ہے کہ: ''سوائے کوفہ اور اس کے آس پاس کے اور کچھ ان کے لیے باقی نہ رہا''۔ آپ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تسلط اور عمل دخل صرف کوفہ اور اس کے پاس رہ گیا تھا، اور پورا عالم اسلام سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہو گیا تھا۔ آپ نے یہ گل بڑی چالاکی اور خوب صورتی کے ساتھ لفظ ''صافی'' کا ترجمہ ''باقی'' کر کے دکھلایا ہے۔

ایک جگہ امام ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ سے ایک عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ یوں فرمایا ہے: (ص ۴)

[فان الثلاثة اجتمعت الامة عليهم فحصل بهم مقصود الامامة]

''یعنی۔ تینوں خلفاء نے پوری امت کو اپنے اوپر مجتمع کر لیا تھا اور اس امامت کا مقصد حاصل ہو گیا تھا''۔

یہ ترجمہ بھونڈا اور مکتبی ہونے کے علاوہ غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے۔

''تینوں خلفاء پر امت نے اجتماع و اتفاق کیا''۔

اس کے الٹنے کی وجہ غالباً یہ بتانا ہے کہ پچھلے خلفاء نے خود اپنے لیے مسلمانوں کو مجتمع و متفق کیا۔ بخلاف خلیفہ چہارم کے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے پر مجتمع و متفق نہ کر سکے۔ گویا یہ کام خلفاء کا تھا جسے آخری خلیفہ نہ کر سکے۔ دیکھئے ترجمہ کو الٹ گیا مطلب لینے کی کوشش کی گئی ہے اور کیسا الزام رکھا گیا ہے۔

ایک جگہ ''الامامۃ والسیاسۃ'' کے حوالہ سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا ایک فقرہ نقل کیا اور اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ (ص ۱۵)

[ان ابى كان يحدثنى ان معاوية سيلى الامر الخ]

''اور میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ معاویہ خلافت پر ضرور فائز ہو جائیں گے''۔

''سیلی الامر'' کا ترجمہ ''خلافت پر ضرور فائز ہو جائیں گے''۔ مبالغہ آمیز ہے۔ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی زبان سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو حتمی اور ضروری سمجھتے تھے، حالانکہ ''سیلی الامر'' کا ترجمہ ہے ''جلد امارت کے مالک ہوں گے'' مگر اس ترجمہ میں مصنف کے ذوق کے مطابق

شدت پیدا نہیں ہوتی، عنقریب امیر ہونے اور خلافت پر ضرور فائز ہونے میں بڑا فرق ہے۔

نیز اسی صفحہ ۱۵ پر حسن رضی اللہ عنہ کا یہ قول ان کے والد علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

[وان عليا ابى كان يقول لا تكرهوا امارة معاوية فانكم لو فارقتموه لرايتم الرؤس تندرعن كواهلها كالحنظل]

”اور میرے والد علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ معاویہ کی امارت (یعنی امیر المومنین ہونے سے) تم کراہت مت کرنا۔ کیونکہ تم نے اگر ان کو بھی گنوا دیا تو دیکھو گے کہ مونڈھوں پر حنظل کی طرح دھڑا دھڑ سر کٹ کر گریں گے“۔

اس ترجمہ میں ایک تو ”امارت“ کی تشریح، امیر المومنین ہونے سے کی گئی ہے جو مصنف کے مطمح نظر کی رعایت سے ہے، ورنہ امامت کا مفہوم ”امیر ہونا“ عام ہے۔ دوسرے ”لو فارقتموہ“ کا ترجمہ ”اور تم نے اگر ان کو بھی گنوا دیا“ کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صاف ترجمہ یہ ہے ”اگر تم لوگ ان سے جدا ہوئے“ مگر گنوا دیا کہہ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کی اہمیت اور اس کے مقابلہ میں حسن رضی اللہ عنہ وغیر کی اس کی شدت احتیاج ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس قسم کی باتیں ذمہ داری اور دیانت داری کے خلاف ہیں۔ اور جن عبارت کو یہ ترجمہ کیا گیا ہے ان کے مفہوم میں تحریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ چند مثالیں دیدہ و دانستہ غلط ترجمہ کر کے اور اپنے مطلب میں زور پیدا کرنے کے لیے اصل عبارتوں کے غلط مطالب لینے کی ہیں، جو سرسری طور سے جمع کر دی گئی ہیں، اس قسم کی حرکتیں کتاب میں اور بھی ہیں۔

ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ کتاب ”خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید“ کے محقق بہت عربی عبارتوں کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے ہیں، جس کی بناء پر بے چارے نے غلط ترجمہ کیا ہے، یا ایسا ترجمہ کر دیا ہے کہ نہ خود سمجھیں نہ دوسرا سمجھ سکے۔ ایک موقع پر یزید کو خلافت و امارت کے بعد بھی ”امیر المومنین“ لکھنے کے بیان میں ابو الحارث لیث بن سعد فہمی کا مقولہ نقل کر کے قاضی ابوبکر بن العربی کی یہ عبارت درج کی اور اسی کا ترجمہ یہ کیا ہے (ص ۲۳۰)

[فسماه الليث امير المومنين بعد ذهاب ملكهم وانقراض دولتهم]

”(یعنی لیث ان کو (یزید کو) اس وقت میں بھی امیر المومنین کہتے تھے جب ان کی حکومت چلی گئی، اور ان کی سلطنت جاتی رہی تھی)“۔

مولف کی عبارت اور ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابوالحارث اللیث بن سعد الفہمی کو نہیں سمجھے، یہ امام اہل مصر الفقہ والحدیث امام لیث بن سعد مصری صاحب الامام الشافعی متوفی ۱۷۵ ہجری ہیں اور امام ابوبکر بن العربی کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امام لیث بن سعد جن کی وفات دولت وخلافت اموی کے تقریباً ۳۵ سال بعد ہوئی وہ بھی امویوں کی خلافت و دولت کے زوال وانقراض کے اتنے بعد تک یزید کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کرتے ہیں، مگر مصنف کو اسلوب نگارش کا پتہ نہ چل سکا، اور ”ملکھم“ اور ”دولتھم“ کی ضمیر کو بجائے امویوں کے یزید کی طرف لوٹا دی اور ترجمہ بھی انتہائی مدلسانہ کیا۔

صفحہ ۲۷۵ پر تین اشعار مع ترجمہ کے درج ہیں۔ تیسرا شعر اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

”(ان عتاب کرنے والوں سے اس کا واسطہ کہ میری زندگی ان کی اطاعت میں گذرتی ہے، یا مٹی مجھے غائب کر دیتی ہے)“۔

یہ ترجمہ نہایت غلط ہونے کے علاوہ نہایت احمقانہ ہے، صحیح ترجمہ یہ ہونا چاہیے۔

”میں اپنے ملامت گروں کا، اگرچہ وہ مجھ پر عتاب نازل کریں، مطیع وفرمان بردار اپنی زندگی بھر نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ مٹی مجھے اپنے اندر چھپالے“۔

”لست لھم مطیعاً کے درمیان ”وان عتبوا“ جملہ معترضہ ہے، اور اس کا واؤ وصلیہ ہے اور ”حیاتی“ کا لفظ ”لست“ کے لیے مفعول فیہ زمانی ہے، اور ”او“ کا لفظ ”الی ان“ کے معنی میں ہے، مطلب بالکل صاف ہے، مگر ہمارے محقق کو کچھ پتہ نہ چلا، اور ایسا ترجمہ کیا کہ وہ نہ سمجھے نہ ہم۔ اسی طرح صفحہ ۲۱۷ پر ایک شعر اور اس کا ترجمہ یوں ہے۔

[وما رست الرجال وما رسونی فمعون علی و مستقیم]

”میں نے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ اور لوگوں نے میری اصلاح کی، تو کسی کو میں کج رو پایا اور کسی کو راہ راست پر“۔

یہاں پر ہمارے محقق نے ”مارست“ کا ترجمہ ”اصلاح کرنا کیا ہے“ حالانکہ اس کے معنی معاملہ، تجربہ، مشق وغیرہ کے ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے، کہ ”میں نے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے، لوگوں نے میرا تجربہ کیا، آزمایا، اس کے نتیجے میں کچھ میرے بارے میں کج رو ہیں اور کچھ راہ راست پر ہیں“۔

صفحہ ۳۲۴ پر یزید کی تعریف میں فضالہ بن شریک شاعر کے دو اشعار نقل کر کے ان کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ بلاشبہ مصنف اور ہم سب کے سر دھننے کے قابل ہے، ملاحظہ ہو:

[اذا ما قریش فاخرت بطریفها   فخرت بمجد یا یزید تلید]

’’قریش جب اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنے لگیں تو اے یزید تم جواباً کہہ دو (بمجد) (عن جد) بزرگی رکھتے ہو (اپنی بزرگی پر فخر کرو)۔

یہاں پر طریف اور تلید کا مطلب ہی سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی یا جان بوجھ کر یزید کے ذاتی فضائل ثابت کرنے کے لیے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ طریف نئے مال اور ذاتی دولت وثروت کو کہتے ہیں اور تلید پرانے مال اور خاندانی ثروت کو، محاورہ ہے کہ ’’مالہ طریف ولا تلید‘‘ یعنی اس کے پاس نیا پرانا کوئی مال نہیں ہے، یعنی نہ ذاتی اوصاف وکمالات ہیں، نہ خاندانی مجد وشرافت ہے، اس شعر کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

’’جب قریش کے لوگ اپنے ذاتی کمالات پر فخر کریں تو تم اے یزید اپنے قدیم اور آبائی مفاخر پر فخر کرو‘‘۔

چونکہ اس ترجمہ میں یزید کے آبائی مناقب ومفاخر کا بیان تھا، اور ذاتی کمالات کی طرف اشارہ نہیں تھا، اس لیے ہمارے خیال میں جان بوجھ کر غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔

دوسرا شعر اور اس کا ترجمہ یوں درج ہے:

[بمجد امیر المومنین ولم یزل   ابوک امین اللہ جد رشید]

’’امیر المومنین ہونے کی بزرگی پر اور اس بات پر کہ تمہارے والد اللہ کے (بوجہ کاتب ہونے کے) امین تھے اور تمہارے دادا قائد ودانشمند تھے‘‘

اس ترجمہ کو اشعار سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی مترجم نے شاید شعر کو کچھ بھی سمجھا ہے، صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہیے:

’’اور وہ مجد تلید جس پر تم فخر کرو گے وہ امیر المومنین ہی کا یعنی آپ ہی کا مجد وشرف ہے، جو سمجھ دار آدمی کا حصہ ہے، اور آپ کے والد کے امین بن کر رہے‘‘۔

یہ ’’بمجد‘‘ پہلے شعر کے ’’بمجد‘‘ کی توضیح وتفسیر اور بدل کے طور پر ہے، اور ’’امیر المومنین‘‘ مضاف الیہ ہے، مراد خود یزید کی

ذات ہے، اور ''لم یزل ابوک امین اللہ'' بیچ میں جملہ معترضہ ہے اور ''جد رشید'' ''صفت یا بدل'' یا توضیح ہے، بجد امیر المومنین کی، ''جد'' کے معنیٰ یہاں حصہ اور نصیب کے ہیں، دادا نانا نہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس عالم ومحقق کو عبارت فہمی میں اس طرح کی دشواری پیش آتی ہو، اور جو عربی اشعار اور عبارتوں کے مطالب ومعانی غلط سمجھتا ہو اس کی کسی معمولی تصنیف وتالیف پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے چہ جائیکہ ''خلافت معاویہؓ ویزید'' جیسی کتاب پر اعتماد کیا جائے، جو بقول مصنف اور بزعم خود بعض اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے، اس موضوع پر تو علم وقلم اور عقل وقلب کو بہت زیادہ توجہ دینے اور فہم وفراست کو ہشیار وبیدار رکھ کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ معلوم نہیں مؤلف محمود احمد عباسی نے کن کن نازک جگہوں پر عبارت سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، اور اسی کے مطابق لکھا ہوگا۔ جہاں اصل عبارت اور ترجمہ آمنے سامنے ہے وہاں تو مقابلہ وتصحیح کی کوشش ہوسکتی ہے، مگر جہاں آپ نے اپنی تحقیق وتدقیق پر کلی اعتماد سے کام لیا ہے وہاں تو بڑی دشواری ہوگی۔

خاص طور سے اردو دان عوام کے لیے یہ کتاب بہت مہنگی پڑے گی، اگر وہ مصنف کی علمیت وقابلیت پر اعتبار واعتماد کرکے اس کا مطالعہ کریں گے۔ افسوس کہ اس اعتبار سے بھی مصنف نے یہ کتاب لکھ کر کوئی خاص کام نہیں کیا، بہت سی موٹی موٹی کتابوں کے نام کی فہرست دے کر اپنے ماخذوں پر اطمینان دلانا اسی وقت معتبر ہوگا جبکہ ان کے سمجھنے اور ان سے اخذ کرنے کی پوری صلاحیت بھی ہوتی۔

باقی رہا کتاب میں مورخوں اور محدثوں کی کتابوں میں قطع وبرید کرنے، درمیان سے عبارت حذف کرنے، عبارتوں کو غلط انداز میں پیش کرنے، علماء پر الزام عائد کرنے اور اقتباسات وحوالہ جات میں بڑی دلیری اور جرأت سے خیانت کرنے کا معاملہ تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں کم از کم پچھتر حرکتیں اس قسم کی ہیں، اور مؤلف (محمود احمد عباسی) نے بڑی جسارت سے علماء ومحدثین کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے، اور یہ ہماری پوری کتاب ہی اس کی دلیل ہے، اور آئندہ قدم قدم پر ایسی ہی حرکتوں کا انکشاف ہوگا۔ اس کتاب میں زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے، اور اسی قسم کی خیانتوں کی نشاندہی کی گئی ہے، مگر اس قسم کی خیانتوں کی نشاندہی صرف اردو، فارسی، اور عربی کی ان کتابوں تک محدود ہے جو عام طور سے پڑھی پڑھائی جاتی ہیں، اور اہل علم کے پاس موجود ہیں۔ مؤلف (محمود احمد عباسی) نے جن مغربی مستشرقین اور انگریزی مراجع وماٰخذ کو استعمال کیا ہے، ان کو ہاتھ نہیں لگایا ہے، حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ اگر اردو فارسی اور عربی کی کتابوں میں ۷۵ فیصد خیانت کی گئی ہے تو انگریزی کتابوں میں اس سے زائد خیانت ہوگی اور ان کے اقتباسات و

تراجم اور مطالب و معانی میں بڑی دلیری اور صفائی سے قطع و برید کیا ہوگا، کیونکہ یہ کتابیں نسبتاً کم پڑھی جاتی ہیں اور عام طور سے لوگ ان کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق انگریزی جاننے والا اس کتاب کے انگریزی ماخذوں کی تحقیق کرے تو مؤلف (محمود احمد عباسی) کی حرکتوں کا ظہور ہو جائے گا، کیونکہ جو شخص عام کتابوں میں اس طرح کی جرأت دکھا کر قطع و برید کرتا ہے، وہ غیر معروف و کم استعمال کتابوں میں کیسے چوک سکتا ہے، مؤلف (محمود احمد عباسی) نے جگہ جگہ یہ بھی کیا ہے کہ اگر ایک کتاب کی عبارت ان کے مطلب کے خلاف ہے تو اسی کی اپنی مطلب کی عبارت کو کسیب دوسری کتاب کے حوالے سے نقل کر دیا تاکہ دیکھنے والے کو معلوم ہو کہ مؤلف (محمود احمد عباسی) کے سامنے اصل کتاب نہیں تھی، اس لیے جتنی عبارت مل سکی انہوں نے نقل کر دیا۔ اس کی ایک مثال ''جہاد قسطنطیہ'' کے بیان میں صفحہ ۲۳ سے مل سکتی ہے، جس میں مؤلف نے ''فتح الباری شرح صحیح بخاری'' کی ادھوری عبارت، حاشیہ بخاری کے حوالے سے درج کی ہے، حالانکہ ان کے مآخذ و مطالعہ میں ''فتح الباری'' بھی ہے، اور انہوں نے جگہ جگہ (مثلاً صفحہ ۸۹ وغیرہ میں) اس کا حوالہ بھی دیا ہے، مگر جہاد قسطنطنیہ میں اس کا حوالہ دینے کے بجائے حواشی بخاری کا حوالہ دیدیا، حالانکہ مؤلف کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، جبکہ وہ اصل کتابوں کی عبارتوں میں قطع و برید کر کے نقل کر دینے کے عادی ہیں۔

ایک اور مجرمانہ حرکت یہ بھی ہے کہ مؤلف جس کتاب کو غیر معتبر و غلط قرار دیتے ہیں اسی سے اپنے لیے استدلال کرنا واجب سمجھ کر اپنے منشا کو ثابت کرتے ہیں، اور جب اس میں خلاف منشا بات آ جاتی ہے تو اسے ''غالی'' کے ''مہمل'' لفظ سے نواز دیتے ہیں، یہ بھی کرتے ہیں کہ ایک کتاب سے ایک مسلسل واقعہ بیان کرنے میں جب کوئی بات خلاف منشا آ جاتی ہے تو دوسری کتاب معتبر یا غیر معتبر کا حوالہ دے دیتے ہیں، اور پھر پہلی کتاب کی عبارت شروع کرتے ہیں، اس قسم کی بہت سی لغویتیں اس کتاب میں موجود ہیں، اور ذرا غور کرنے کے بعد پڑھنے والے سامنے آ جاتی ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کا دورِ خلافت

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ہر طرح ناکام ثابت کرنا مؤلف کا پہلا کام تھا، انہوں نے لکھا ہے:

[عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد جب سبائی لیڈر مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں نے علیؓ سے بیعت خلافت کرنی چاہی آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور متنبہ کیا۔ مگر افسوس کہ حضرت

موصوف نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا، اور بیعت لے لی، یہ بیعت چونکہ باغیوں اور قاتلوں کی تائید اور اصرار سے ہوئی تھی، اور یہ خلافت ہی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ یسے محبوب خلیفہ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی، نیز قاتلین سے قصاص جو شرعاً واجب تھا نہیں لیا گیا، اور نہ قصاص کے لیے جانے کا کوئی امکان رہا تھا، کیونکہ باغی اور قاتل اور گروہ کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا سبأیین کے گروہ میں نہ صرف شامل، بلکہ سیاست وقت پر اثر انداز رہے، اکابر صحابہ نے بیعت کرنے سے گریز کیا، اس لیے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی'' (ص: ۲)

یہ کتاب ''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید'' کی بسم اللہ ہے، جس سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے ضدی اور ہٹ دھرم اور عاقلانہ مشورہ قبول نہ کرنے والا بتایا گیا ہے، نیز یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی خلافت صرف سبائیوں اور باغیوں کی وجہ سے قائم ہوئی اور اس کی بنیاد قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ پر رکھی گئی، خون عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے تمام امکانات ختم کر دیئے گئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نام پر سبائی گروہ خلافت پر قابض و دخیل تھا، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے، اس پوری عبارت کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے سے مؤلف (محمود احمد عباسی) کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جذبہ کا پتہ چلتا ہے، اور ان کے دل کی ایک ایک تصویر ان الفاظ میں رقص کرتی نظر آتی ہے۔

مؤلف نے خیانت سے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب ''ازالۃ الخفاء'' سے عبارت نقل کی، اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی مؤلف (محمود احمد عباسی) کے ہمنوا ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے پہلے وہ دلیل بیان کی، جس کی بنیاد پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد تسلیم کیا جاتا ہے، اور سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کو ان کی خطائے اجتہادی بتایا، پھر ان حضرات کے بیعت نہ کرنے کا جو شبہ تھا اسے شاہ صاحب نے بیان کیا ہے۔

''خلافت بدائے علی مرتضیٰ قائم نہ شد الخ'' (ازالۃ الخفاء ۲/ ۲۷۹)

مگر مؤلف نے ان حضرات کے اس خیال کو شاہ ولی اللہ صاحب کی رائے کہہ کر نقل کر دیا، اور دھوکہ دینا چاہا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ میرے ہی خیالات نہیں ہیں، بلکہ شاہ ولی اللہ بھی اس کے ہمنوا ہیں۔

مؤلف اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

[ان اہلِ حل وعقد کو جس میں اکابر صحابہ کی جماعت شامل تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات سے کوئی مخالفت نہ تھی، اور نہ ان کے خلیفہ منتخب ہونے پر کسی قسم کا اعتراض تھا۔ یہ حضرات انتخاب وبیعتِ خلافت میں سبائی گروہ کی درانداز یوں کو مصالح ملیّہ کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے امت کی بھاری اکثریت نے بیعت نہیں کی الخ] (ص: ۲)

اس میں بھی مؤلف نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو غلط کار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ کہہ کر کہ ''اکابر صحابہ سبائی گروہ کی در اندازیوں کو مصالح ملیّہ کے خلاف سمجھتے تھے''۔ بتانا چاہا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان سبائیوں کی دست درازیوں کو مصالح ملیّہ کے مطابق سمجھ کر ان کے ہاتھ میں کھیل رہے تھے، اور ان کی خلافت سراسر سبائی گروہ کی خلافت تھی، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی غلطی یا مجبوری کی وجہ سے ان میں پھنس گئے اور چھوٹ نہ سکے، اور ان کا پورا دور سخت ناکام ہوگیا، چانچہ ارشاد ہوتا ہے:

[حضرت موصوف کی یہ خطائے اجتہادی تھی یا بے بسی اور مجبوری، نتیجہ یہ ہوا کہ بخلاف حضرات خلفائے ثلاثہ جن کی بیعت پر تمام امت مجتمع تھی، اتحاد واتفاق تھا، کفار کے مقابلہ میں جہادی سرگرمیاں تھیں، بڑے بڑے ملک فتح ہوئے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہ کوئی جہاد ہوا، نہ کوئی ملک وشہر فتح ہوا (ص: ۳) نہ ملت ان کی بیعت پر مجتمع ہوئی، آپس ہی میں تلواریں چلتی رہیں''۔ (ص: ۴)

مؤلف نے پوری کتاب میں جو جو بے ہودگیاں، غلط بیانیاں کی ہیں، ان کو ایک طرف رکھا جائے اور ذیل کی چند سطریں ایک طرف رکھی جائیں، تو ان کا پلہ سب پر بھاری ہوگا، کوئی جری سے جری خارجی بھی ان کے کہنے کی جراءت نہیں کرسکتا ، ہم ان سطروں کو مؤلف کی پوری کاوش کا خلاصہ اور نتیجہ سمجھتے ہیں:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل نہیں ہوئی تھی، امت کی بہت بڑی اکثریت ان کی بیعت میں داخل نہیں تھی، ان کے خلاف جو حضرات کھڑے ہوئے تھے وہ بڑی جمیعت رکھتے تھے، ان کے قبضے میں ملک تھے، اور لاکھوں انسانوں کی حمایت انہیں حاصل تھی، پھر ایسا خلیفہ جسے جمہور کی حمایت حاصل نہ ہو، جب شرعاً اس کا مجاز ہے کہ اپنے مخالفوں کے خلاف تلوار اٹھائے تو پھر امیر یزید جو متفق علیہ خلیفہ تھے، جن کا پرچم عالم اسلام پر لہرا رہا تھا، جن کی بیعت میں سینکڑوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباس، حسین کے بھائی حضرت محمد بن علی (ابن الحنفیہ) جیسی مقتدر (ص: ۱۷۹) ومقدس ہستیاں داخل تھیں وہ اس کے مجاز کیوں نہیں کہ اپنے خلاف خروج کرنے والوں کا مقابلہ کریں، حضرت

علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تلوار اگر حضرت ام المومنین عائشۃ صدیقہ رضی اللہ عنہا زوجہ وحبیبہ رسول اللہ سلام اللہ علیہا کے خلاف بے نیام ہوسکتی ہے، اور اس ہودن پر تیر برسائے جاسکتے ہیں، جس میں تمام امت کی ماں تشریف فرماں ہو، اور ماں بھی وہ جو حجت دینیہ کے تحت میدان میں آئی ہو تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف تلوار کیوں نہیں اٹھائی جاسکتی، جن کی دعوت محض یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرزند ہونے کی حیثیت سے انہوں خلیفہ بنایا جائے''۔ (ص:۱۸۰)

ان چند جملوں میں مؤلف نے پورا زہر استعمال کیا ہے اور یہ باتیں ثابت کرنی چاہی ہیں:

(۱) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کامل ومکمل بیعت نہیں تھی، کے خلاف جو لوگ تھے وہ ان کے موافقین سے زیادہ تھے۔

(۲) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا پر اپنی تلوار کھینچی، اور ان پر وار کیا، یہ جملہ نہایت ہی زہریلا ہے، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر شرمناک افتراء ہے، جس کے لیے دین ودیانت کے ساتھ ساتھ واقعات سے بھی آنکھ بند کرنی پڑتی ہے۔ کوئی کٹر خارجی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

(۳) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر یہ الزام کہ وہ اپنے کو فرزندِ علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نواسہ ہونے کی وجہ سے خلافت کا حق دار قرار دیتے تھے، نہایت ہی سنگین ہے، ان حضرات کے بارے میں اس طرح کی بات ان قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں موجود ہیں۔

مؤلف نے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک عبارت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے اور ان کے مقصد ومنشاء کے خلاف ان کی عبارت کا مطلب اپنے ذوق کے مطابق لینا چاہا ہے۔

اب آیئے، ہم بتائیں کہ مؤلف نے کتاب میں جن علمائے اسلام سے استشہاد کر کے ان کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی ہے ان کا مسلک کیا ہے اور وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اور آپ کیا باور کرنا چاہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تصریحات

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' کے مقصد اوّل کی فصل اول کو خلافت عامہ (خاصہ نہیں) کے بیان سے شروع فرمایا ہے، اور خلافت عامہ کی تعریف وغیرہ بیان کرنے کے بعد خلافت عامہ منعقد ہونے

کے چوتھے طریقہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: [1]

(واین دو نوع است، یکے آنکہ مستولی مجتمع شدوط باشد، وصدف منازعین کند، وبصلح وتدبید وغیدارتکاب محدمی وایں جائز است ورخصت، وانعقاد خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابی سفیان بعد حضرت مدتضی رضی اللہ عنہ وبعد صلح امام حسن رضی اللہ عنہ نوع بود الخ)

’’اس چوتھے طریقے کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم یہ ہے استیلاء کرنے والا خلافت کی شرطوں کو جامع ہو، اور بغیر کسی ناجائز امر کے صلح اور تدبیر سے مخالفوں کو مزاحمت سے باز رکھے، یہ قسم عند الضرورت جائز ہے، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد، سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے صلح کر لینے کے بعد اسی طرح سے ہوا تھا۔ الخ‘‘۔

یہاں پر شاہ صاحب نے اہل سنت والجماعت کے مسلک کو واضح الفاظ میں بیان فرما کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت عامہ کو بیان فرمایا ہے، اور ان کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو انعقاد خلافت کے چوتھے طریقے کی رو سے خلیفہ عام تسلیم فرمایا ہے۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کے متعلق فرماتے ہیں:

(واہل علم تکلم کردہ اند درآنکہ خلافتِ حضرت مدتضیٰ بکدام طریق از طرقِ مذکورہ واقع شد، مقتضائے کلام اکثر آنست کہ بہ بیعت مہاجرین وانصار کہ درمدینہ حاضر بودند خلیفہ شدند، واکثد ہائے حضرت مدتضیٰ رضی اللہ عنہ کہ باہل شام نوشتہ اند شاہد ایں معنیٰ است)

’’اہل علم نے اس بات میں کلام کیا ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت چار مذکورہ طریقوں سے کس طریقہ پر واقع ہوئی،، اکثر علماء کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان مہاجرین اور انصار کے بیعت کر لینے سے خلیفہ ہوئے جو مدینہ میں موجود تھے، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اکثر وہ خطوط جو آپ نے اہلِ شام کو لکھے، اس پر شاہد ہیں ‘‘۔

اس قول کو شاہ ولی اللہ صاحب نے راجح قرار دیتے ہوئے پہلے بیان فرمایا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ عامہ کو انعقاد کو

مدینہ منورہ کے مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہ کے بیعت کر لینے کی وجہ سے قرار دیا، اوراس کی تائید سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطوط سے فرمائی، اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے اس بارے میں علماء کے ایک گروہ کا دوسرا قول نقل فرمایا ہے، جس میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد بذریعہ شوریٰ ہوا۔

مقصد اول کی فصل اول کے خاتمہ پر شاہ صاحب حاصل کلام کے طور پر فرماتے ہیں:

”جب خلافت کے معنیٰ اور خلیفہ کی شرطیں اور خلافت کے متعلقات معلوم ہو چکے تو اب وہ وقت آ گیا کہ ہم اصل مقصد کی رجوع کریں، خلفاء اربعہ کے لیے خلافت عامہ کا ثابت ہونا اعلیٰ بدیہات سے ہے، کیونکہ جب ہم خلیفہ کا مفہوم اور اس کی شرطیں ذہن میں لاتے ہیں، اور خلفائے اربعہ کے حالات جو بسند مستفیض معلوم ہوئے ہیں، نظر ڈالتے ہیں تو بدیہی طور پر خلافت کی شرطوں کا ان میں پایا جانا اور خلافت کے مقاصد کا اکمل طور پر ان سے ظاہر ہونا واضح ہو جاتا ہے، اور کسی طرح کا خفا باقی نہیں رہتا اور اگر خلفائے اربعہ کی خلافت کے ثبوت میں کوئی پوشیدگی ہے تو وہ خلافت کے مفہوم میں معنیٰ مذکورہ کے علاوہ دوسرے معانی شامل کرنے کی وجہ سے ہے، جیسا کہ شیعہ عصمت اور وحی باطنی کو امام کے لیے شرط کرتے ہیں، ورنہ اسلام اور عقل اور بلوغ اور حریت، اور ذکورت اور سلامتی اعضاء اور قریشیت کا ان بزرگوں یعنی خلفائے اربعہ میں پایا جانا کسی عاقل کے لیے محل بحث نہیں ہوسکتا، اور نیز کوئی دانشمند اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرتدوں سے جنگ کرنا، اور بلاد عجم اور بلاد روم کو فتح کر لینا، اور کسریٰ وقیصر کے لشکروں کو شکست دینا انہیں خلفاء کی تدبیر اور انہیں کے حکم سے ہوا ہے۔ اور کفایت کرنے والے کے لیے اس قدر کافی ہے الخ“۔

شاہ صاحب کے اس بیان میں کہیں بھی سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نہ حرف گیری ہے، نہ اس کا کوئی ادنیٰ شائبہ ہے، اور نہ ہی ان کی خلافت کی ناکامی ونامرادی کا کوئی ذکر ہے، بلکہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کی پوری ترجمانی ہے۔

مگر، ”خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید“ کے مؤلف (محمود احمد عباسی) نے شاہ صاحب کی اسی کتاب سے اپنے منشاء کے مطابق عبارتیں نقل کر کے ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاہ صاحب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے قیام کے منکر تھے، ان کی خلافت کا دائرہ صرف کوفہ اور اس کے اطراف تک محدود تھا، اور وہ اپنے اقدام پر ہمیشہ افسوس فرماتے رہے، حالانکہ صورت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے کتاب میں جگہ جگہ ان کے دور کے فتنوں اور ہنگاموں کا تذکرہ فرمایا ہے، اور ان سے پیدا ہونے والے ابتلاء کو واضح کیا ہے، مگر مؤلف نے شاہ صاحب کی ان ہی عبارتوں کو لے کر استدلال کیا ہے،

جیسے شاہ صاحب بھی اس کے ہم نوا ہیں، مؤلف نے امام ابن تیمیہ کے بارے میں یہی حرکت کی ہے[11] اور ان کی عبارتوں کو جو کسی خاص واقعہ اور مسئلہ سے متعلق ہیں، اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کی تصریحات

علامہ ابنِ خلدون کو مؤلف کتاب ''خلافتِ معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید'' محمود احمد عباسی نے بڑی اہمیت دی ہے اور ان کو فنِ تاریخ کا امام مانا ہے اور اس معاملہ میں ان کو منفرد تسلیم کیا ہے ہم ان کا پورا بیان نقل کرتے ہیں، چونکہ عبارتیں بہت طویل ہیں اس لیے ہم ان کو نقل نہیں کرتے، اور صرف ان کے ترجمے پر اکتفاء کرتے ہیں، جس کا جی چاہے ترجمہ کو اصل عبارت سے ملا لے۔

علامہ ابن خلدون مقدمہ میں ''الفصل الثلاثون فی ولایۃ العہد'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت لوگ مختلف شہروں میں متفرق تھے، اس لیے بیعتِ علی رضی اللہ عنہ میں حاضر نہ ہو سکے، اور جو لوگ حاضر تھے ان میں کچھ نے بیعت کی اور کچھ نے توقف کیا، یہاں تک کہ لوگ مجتمع ہو کر کسی امام پر اتحاد و اتفاق کریں، جیسے سعد رضی اللہ عنہ، سعید رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ، قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ، ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ، فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ، اور ان حضرات جیسے دوسرے اکابر صحابہ اور جو لوگ مختلف امصار میں تھے وہ بھی علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے ہٹ کر عثمان رضی اللہ عنہ کے دَم کی طلب میں پڑے، اور ان حضرات نے معاملہ کو پراگندہ چھوڑ دیا، یہاں تک کہ کسی کو بھی والی بنانے کے لیے مسلمانوں کے درمیان شوریٰ منعقد ہو جائے، اور ان لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کے قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے سکوت کرنے کو ان کی طرف سے نرمی کا گمان کیا، نعوذ باللہ غفلت اور دیر کا گمان نہیں کیا، چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی جب علی رضی اللہ عنہ کو اپنی سرزنش کرتے تو اسے فقط علی رضی اللہ عنہ کے دمِ عثمان رضی اللہ عنہ پر سکوت ہی کی بنا پر کرتے، اس کے بعد یہ حضرات مختلف الرائے ہو گئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ ان کی بیعت منعقد ہو چکی ہے اور اس پر ان لوگوں کے مجتمع ہونے کی وجہ سے جو دار نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وطنِ صحابہ رضی اللہ عنہم یعنی مدینہ میں موجود تھے، میری بیعت ان لوگوں پر لازم ہو گئی ہے، جو اس سے رہ گئے ہیں، اور دمِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کے امر کو لوگوں کے اجتماع اور اتفاق کلمہ تک ٹال دیا کہ ایسا ہونے کے

بعد وہ اس کام کو کر سکیں گے۔ [1]

دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ ان کی بیعت منعقد نہیں ہوئی، کیونکہ اہل حل وعقد صحابہ آفاق میں پھیلے ہوئے ہیں، اور قلیل لوگ ان کی بیعت میں حاضر ہوئے ہیں، اور بیعت کا انعقاد اہل حل وعقد کے اتفاق سے ہوتا ہے اور ان کے علاوہ لوگوں کو منعقد کرنے یا ان ہی میں سے قلیل تعداد کے منعقد کرنے سے بیعت منعقد نہیں ہوئی، انہوں نے سمجھا کہ اس وقت مسلمان منتشر ہیں، اس لیے وہ پہلے دمِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس کے بعد کسی امام پر متحد ومتفق ہوں گے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا، زبیر رضی اللہ عنہ ان کے صاحبزادے عبد اللہ رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادے محمد رضی اللہ عنہ سعد رضی اللہ عنہ، سعید رضی اللہ عنہ، نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ اسی خیال کی طرف گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم ان حضرات کی رائے پر تھے اور مدینہ میں علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شریک نہ ہوئے، یہ سب بھی اسی طرف گئے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، مگر یہ کہ ان حضرات کے بعد لوگوں نے (اہل العصر الثانی من بعدھم) علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے انعقاد پر، تمام مسلمانوں پر اس کے لازم ہونے پر، اور ان کی رائے کے صحیح ہونے پر اور معاویہ رضی اللہ عنہ اور جو ان کی رائے پر تھے، خصوصیت کے ساتھ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ جنہوں نے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کے بعد توڑ دیا تھا ان سب کی طرف سے خطا کے متعین ہونے پر اتفاق کیا، اور ساتھ ہی ہر دو فریق سے گناہ کی نسبت کو دفع کیا، جیسا کہ مجتہدین کا معاملہ ہوتا ہے اور یہ اہلِ عصر ثانی کی طرف سے اہل عصر اوّل کے دو اقوال میں سے ایک قول پر اجماع ہو گیا، جیسا کہ معروف ومشہور ہے، ایک مرتبہ علی رضی اللہ عنہ سے جمل اور صفین کے مقتولوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ’’قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، ان لوگوں (فریقین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں سے جو اس حال میں مرے گا کہ اس کا دل پاک ہوگا، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا‘‘۔ اس قول کو طبری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

پس تمہارے نزدیک ان میں سے کسی کی عدالت کے بارے میں ریب اور شک نہ ہو، اور نہ ہی تمہارے نزدیک اس معاملہ میں کسی میں قدح وبرائی ہو، کیونکہ تم جان چکے ہو کہ وہ کون لوگ ہیں، ان کے اقوال وافعال مستندات ہیں، اور ان کی عدالت اہل السنۃ کے نزدیک مسلم اور مفروغ عنہ ہے، مگر معتزلہ کا ایک قول ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیا، اس قول کی طرف اہل حق میں سے کسی نے توجہ نہیں کی، اور نہ اس کی طرف رخ کیا، اور جب

تم انصاف کی آنکھ سے دیکھو گے تو عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں اختلاف میں تمام لوگوں کو معذور سمجھو گے، اور تم کو معلوم ہو گا کہ یہ ایک فتنہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اس امت مبتلا فرمایا تھا''۔ (مقدمہ ص: ۱۷۸-۱۷۹)

ہم نے ترجمہ میں شدّتِ احتیاط سے کام لیا ہے، اور عبارت آرائی سے بچتے ہوئے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ ابن خلدون کی اس تفصیل سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موقف اور ان کی نیت کے بارے میں اعتدال و استقامت کی جو رائے ملتی ہے وہ علامہ ابنِ خلدون جیسے ناقد محتاط اور مورخ ذی ہوش کا حق ہے، خوب یاد رکھئے کہ یہ کسی اصولی اور متکلم کی رائے نہیں ہے، بلکہ ایک مورخ اور ناقد کی رائے ہے، بتایئے اس مین کسی جگہ سے بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ یا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں حرف گیری کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے؟ یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کوئی نقض ہے؟

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تصریحات

علامہ ابن تیمیہ کی یہ تصریحات ہم ان کی کتاب منہاج السنۃ کے مختصر ''المنتقیٰ'' سے پیش کر رہے ہیں، جسے علامہ شمس الدین ذہبی نے مرتب فرمایا ہے۔

امام ابن تیمیہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کے بارے میں تصریح فرماتے ہیں:

[فهذه بيعة على امتنع خلق من الصحابة والتابعين من لا يحصيهم الا الله تعالى فذالك قادح فى امامته و مذهب اهل السنة ان الامامة تنعقد عندهم بموافقة اهل الشوكة الذين يحصل بهم مقصود الامامة وهو القدرة والتمكين ، ولهذا يقولون من صار له قدرة و سلطان يفعل به مقصود۔ الولاية فهو من اولى الامر ، المامور بطاعتهم مالم يامروا بمعصية الله فالامامة ملك و سلطان برة كانت او فاجرة والملك لا يصير ملكا بمواقفه ثلاثة او اربعة ولهذا لما بويع على وصار معه شوكة صار اماما]۔ (ص : ۵۸)

''یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت جس سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے اتنے لوگ رکے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ان کو کوئی شمار نہیں کر سکتا، تو کیا یہ بات ان کی امامت کے لیے قادح ہے؟ اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک امامت و

خلافت ان اہل شوکت کی موافقت سے منعقد ہوتی ہے جن سے امامت کا مقصود حاصل ہوتا ہو، یعنی قدرت اور تمکین ہو، اس لیے کہ اہلِ سنت کا قول ہے کہ جس کے قدرت اور سلطنت ہو جائے کہ وہ اس کے ذریعہ ولایت و امامت کا مقصد پورا کرنے لگے تو وہ اولی الامر میں سے ہے، جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، جب تک وہ اللہ کی معصیت کا حکم نہ کریں، پس امامت ملک اور طاقت ہے، نیک ہو یا بد ہو، اور ملک تین یا چار آدمیوں سے ملک نہیں ہو سکتا، اس لیے جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی گئی اور شوکت ان کے ساتھ ہو گئی تو وہ امام وخلیفہ ہو گئے“۔

اس تصریح میں امام ابن تیمیہ نے اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کو ہر طرح کامل ومکمل تسلیم کیا ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے، آگے چل کر شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا ذکر کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ نے علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں پانچ اقوال نقل کئے ہیں، اور تیسرے قول کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے:

[وقالت طائفة ثالثة بل على هو الامام وهو مصيب فى قتال من قاتله كطلحة والزبير وهم مصيبون بناء علىٰ ان كل مجتهد مصيب كقول ابى الهذيل والجبائى وابنه وابن الباقلانى واحد قولى الاشعرى وهم لا يجعلون معاوية مجتهدا مصيباً] (ص : ۵۹)

” اور تیسرے گروہ نے کہا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ ہی امام وخلیفہ ہیں اور جن لوگوں نے ان سے قتال کیا، جیسے طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ ان سے قتال کرنے میں صواب وحق پر ہیں، اور وہ لوگ بھی صواب وحق پر ہیں۔ اس بنا پر کہ سب کے سب مجتہد مصیب ہیں، جیسا کہ ابوالہذیل الجبائی، اس کے بیٹے اور ابن باقلانی کا قول اور اشعری کے دو اقوال میں سے ایک قول ہے، اور یہ لوگ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی مجتہد مصیب نہیں مانتے“۔

امام ابن عبدالبر اندلسی رحمہ اللہ کی تصریحات

امام حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ المعروف ابن عبدالبر قرطبی اندلسی متوفی ۴۶۳ ہجری اندلسی علماء میں بہت بڑے محدث وحافظ حدیث ہیں، جن کا ذہن ودماغ اموی اور ہاشمی آویزشوں سے پاک تھا، اور جن کی کتاب ”الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب“ کو مؤلف کتاب خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید نے بھی ”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کی معتبر کتاب“ قرار دیا

ہے(ص:۲۱٦)

اور پانچویں نمبر کا ماخذ قرار دیا ہے۔

ان ہی علامہ عبدالبر نے اسی کتاب میں علی ؓ کے حال میں لکھا ہے:

[بویع لعلی رضی اللہ عنه بالخلافة یوم قتل عثمان رضی اللہ عنه واجتمع علی بیعته المهاجرون والانصار ، وتخلف عن بیعته منهم نفر فلم یهجوهم ، ولم یکرههم وسئل عنهم فقال اولئک قوم قعدوا من الحق ولم یقوموا مع الباطل وفی روایة اخری اولئک قوم خذلوا الحق ولم ینصروا الباطل ، و تخلف ایضاً عن بیعته معاویة ومن معه فی جماعة اہل الشام فکان منهم فی صفین بعد الجمل ما کان تغمد اللہ جمیعهم بالغفران] (الاستیعاب ۲/۴۸۱)

''علی ؓ کے لیے خلافت کی بیعت عثمان ؓ کی شہادت کے دن ہی کر لی گئی اور آپ کی بیعت پر مہاجرین اور انصار متفق ومجتمع ہوئے، اور آپ کی بیعت سے ان میں سے چند آدمی رہ گئے، مگر علی ؓ نے نہ ان کی ہجو کی، اور نہ ہی ان پر دباؤ ڈالا، اور جب ان کے بارے میں علی ؓ سے سوال کیا گیا تو کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو حق سے تو بیٹھ رہے، مگر باطل کے ساتھ کھڑے نہیں ہوئے اور ایک روایت میں ہے کہ ان لوگوں نے حق کو رسوا کیا مگر باطل کی مدد نہیں کی، نیز علی ؓ کی بیعت سے معاویہ ؓ اور جو لوگ اہل شام کی جماعت سے ان کے ساتھ، رہ گئے، اور ان کی طرف سے جمل کے بعد صفین میں جو کچھ ہوا، اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت میں چھپالے''۔

صحابہ کرام ؓ کے حالات کی معتبر کتاب کی یہ تصریحات اہل علم وتحقیق کے نزدیک نہایت معتبر ہیں۔

بیعت وخلافت کامل ومکمل تھی

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، علامہ ابن خلدون ، امام ابن تیمیہ اور امام ابن عبدالبر اندلسی رحمہم اللہ جن کو مؤلف کتاب (محمود احمد عباسی) ''کتاب خلافت معاویہ ؓ ویزید'' میں حجت مانتے ہیں، ان کی تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے کہ شہادت عثمان ؓ کے بعد علی ؓ کی بیعت عامہ ہوگئی اور مدینہ کے انصار ومہاجرین کے بیعت کر لینے سے خلیفہ کا

تقرر ہو گیا، جیسا کہ اس سے پہلے خلفائے ثلاثہ کا انتخاب وتقرر بھی اہل مدینہ ہی کے اتفاق واجتماع سے ہوا تھا، اور اس طرح ایک خلیفہ کے منتخب ومقرر ہو جانے کے بعد دوسرے کا انتخاب غلط تھا، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں اسی حقیقت کو بیان کیا:

[ایها الناس بایعتمونی علیٰ ما بویع علیه من کان قبلی ، و انما الخیار قبل ان تقع البیعة فاذا وقعت فلا خیار ، وانما علی الامام الاستقامة ، و علی الرعیة التسلیم ، وان هذه بیعة ، من ردها رغب عن الاسلام] (الاخبار الطوال ص ۱۴۳ طبع مصر)

”اے لوگو! تم نے میری بیعت ان ہی باتوں پر کی ہے جن پر مجھ سے پہلے حضرات کی بیعت کی گئی ہے، بیعت ہو جانے سے پہلے انتخابِ امام وخلیفہ میں اختیار تھا، اور جب بیعت ہو چکی تو اب یہ اختیار باقی نہیں رہا، اب تو امام کے ذمہ استقامت اور عوام کے ذمہ تسلیم ورضا ہے، اور جو آدمی اس بیعت کو رد کرے گا اسلام کی راہ سے بے راہ ہوگا“۔

نیز علی رضی اللہ عنہ سے اسی حقیقت کو اس وقت بھی بیان کیا جب ان کے صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے آپ سے فلاں فلاں گذارش کی، مگر آپ نے توجہ نہ فرمائی۔

[اما انتظاری طاعة جمیع الناس من جمیع الآفاق فان البیعة لا تکون الا لمن حضر الحرمین من المهاجرین والانصار ، فاذا رضوا وسلموا وجب علی جمیع الناس الرضا والتسلیم] (الاخبار الطوال طبع مصر ص : ۱۴۷)

”رہا میرا انتظار کرنا کہ پوری دنیا سے تمام لوگ میری اطاعت کر لیں، تو ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بیعت صرف ان مہاجرین وانصار سے مکمل ہو جاتی ہے جو حرمین میں موجود ہیں، جب ان حضرات نے اسے تسلیم کر کے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو اب تمام لوگوں پر تسلیم ورضا واجب ہے“۔

پھر اسی بات کو علی رضی اللہ عنہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کو بار بار یاد دلایا اور لکھا ہے کہ حرمین کے مہاجرین وانصار نے میری بیعت کر لی ہے، اور ان کی بیعت کر لینے کے بعد خلیفہ کا انتخاب ہو گیا، تم لوگ بھی میری بیعت میں داخل ہو جاؤ، بیعت سے پہلے انتخاب کا حق حاصل تھا، مگر جب بیعت مکمل ہو گئی تو اب اختلاف کا حق باقی نہیں رہا، اور اب تسلیم ورضا ضروری ہے، جیسا کہ پہلے تین خلفاء کے بارے میں ہو چکا ہے۔

انصار ومہاجرین اور عامۃ المسلمین نہ صرف علی رضی اللہ عنہ کی بیعت وخلافت کو تسلیم کرتے تھے، بلکہ ان کے خلاف فتنہ برپا کرنے کو غلط قرار دیتے تھے اور دل سے اسے بُرا سمجھتے تھے، مگر ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ احادیث تھیں جن میں ان فتنوں سے بچنے کی تلقین کی گئی تھی، اور کلمہ پڑھنے والوں پر تلوار اٹھانے کی سخت ممانعت کے ساتھ آپس میں اختلافات میں گھر میں بیٹھ رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ مورخ ابوحنیفہ دینوری کا بیان ہے:

[ثم ان عليا رضى الله عنه اظهرانه يريد السير الى العراق۔ فوافاه الناس الا ثلاثة نفر سعد ابن ابى وقاص ، و عبد الله بن عمر الخطاب ، و محمد بن مسلمة الانصارى] (ص : ۱۴۲)

”بیعت کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے عراق جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو تمام لوگوں نے ان کی موافقت کی، البتہ تین حضرات سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ تیار نہ ہوئے“۔

علامہ دینوری نے صاف طور سے لکھا ہے کہ مدینہ کے تمام انصار ومہاجرین علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے کر عراق جانے کے لیے تیار ہوئے، صرف تین حضرات نے اس سے معذرت کی، وہ بھی علی رضی اللہ عنہ کو امام وخلیفہ تسلیم کرتے ہوئے صرف فتنہ سے بچنے کی وجہ سے، چنانچہ جب علی رضی اللہ عنہ نے عراق جانے کی تیاری کی اور لوگوں میں اس کا اعلان کر کے ساتھ چلنے کی تلقین کی، تو یہ تینوں حضرات تشریف لائے، اور علی رضی اللہ عنہ نے ان حضرات سے فرمایا کہ:

[قد بلغنى عنكم هنات كرهتما لكم]

”آپ لوگوں کی طرف سے میرے پاس کچھ نامناسب باتیں پہنچیں ہیں، جنہیں آپ لوگوں کے لیے ناپسند کرتا ہوں“۔

یہ سن کر سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

[قدما كان بلغك فاعطنى سيفاً يعرف المسلم من الكافر حتّٰى اقاتل به معك]

”اگر آپ کو یہ بات پہنچی ہے تو آپ مجھے ایسی تلوار دیجئے جو مسلمان اور کافر میں تمیز کرے تا کہ میں اس سے آپ کے ساتھ رہ کر جنگ کروں“۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا:

[انشدک اللہ ان تحملنی علی ما لا اعرف]

’’میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ مجھے اس چیز پر محمول نہ کریں جسے میں خود نہیں جانتا‘‘۔

اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

[ان رسول اللہ امرنی ان اقاتل بسیفی ما قوتل به المشرکون ، فاذا قوتل اہل الصلوٰۃ ضربت به صخر حتیٰ ینکسر ، وقد کسرته بالامس ‘] (اخبار الطوال ص : ۱۴۴)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اپنی تلوار سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ اس سے مشرکوں سے جنگ کی جائے، اور جب نماز پڑھنے والوں سے جنگ کی جائے تو میں اسے جبل اُحد کے کسی پتھر پر ماروں تاکہ ٹوٹ جائے، میں نے کل اپنی تلوار توڑ دی ہے‘‘۔

اس کے بعد یہ حضرات وہاں سے چلے گئے اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور فرمایا:

[اعفنی الخروج معک فی هذا الوجه فانی عاهدت الله ان لا اقاتل من یشهد ان لا اله الا الله] (ص : ۱۴۵)

’’ایسی صورت میں آپ مجھے اپنے ساتھ نکلنے سے معاف کیجئے، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کیا ہے کہ کلمہ شہادت پڑھنے والے سے جنگ نہیں کروں گا‘‘۔

ان میں سے دو مہاجرین میں سے تھے جنہوں نے طبقہ مہاجرین کے ترجمان کی حیثیت سے گفتگو کی، پھر جس وقت علی رضی اللہ عنہ عراق کے لیے نکلنے لگے تو انصار کے اعیان و اشراف حاضر ہوئے۔

[اجتمع اشراف الانصار فاقبلوا حتی دخلوا علیٰ علی]

’’انصار کے اعیان و اشراف جمع ہو کر علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے‘‘۔

طبقہ انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے عقبہ بن عامر بدری انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا:

[يا امير المومنين ان الذى يفوتك من الصلوٰة فى مسجد رسول الله ﷺ والسعى بين قبره و منبره اعظم مما ترجو من العراق فان كنت تسير لحرب اهل الشام فقد اقام عمر فينا وكفاه سعد زحف القادسية۔ ابو موسىٰ زحف الاهواز وليس من هولاء رجل الا ومثله معك والرجال اشباه والايام دول]

’’اے امیر المومنین! یہ جو مسجد نبوی ﷺ میں آپ کی نماز اور آپ کے منبر و قبر کے درمیان چلنا پھرنا فوت ہوگا۔ اس کا مرتبہ اس سے زیادہ ہے، جس کی عراق میں آپ کو اُمید ہے، اگر آپ اہل شام سے جنگ کے لئے جا رہے ہیں تو عمر ؓ مدینہ میں ہمارے اندر رہے اور ان کی طرف سے سعد ؓ نے قادسیہ اور ابو موسیٰ ؓ سے اہواز کا مورچہ سنبھالا تھا آپ کے پاس بھی ان جیسے آدمی ہیں آدمی ایک دوسرے جیسے ہوتے ہیں اور زمانہ آتا جاتا رہتا ہے۔

علی ؓ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: ’’مال اور آدمی عراق میں ہیں اور اہل شام کی اچھل کود ہو رہی ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ شام سے قریب رہوں‘‘۔

خلافتِ اسلامیہ کے انعقاد کے بعد بھی جن چند حضرات نے علی ؓ کی بیعت نہیں کی تھی، آپ نے ان کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا، نہ ان پر سختی کی، نہ بیعت کے لیے مجبور کیا، حالانکہ خلیفہ ہو جانے کے بعد آپ کو اس کا حق حاصل تھا، بلکہ صرف اتنا فرمایا:

[اولئک قوم قعدوا من الحق ولم يقوموا مع الباطل] (الاستيعاب ۲/۴۸۱)

’’یہ لوگ حق کی مدد سے بیٹھ رہے، مگر باطل کی حمایت میں کھڑے نہیں ہوئے‘‘۔

اس سے جانبین کے دلوں کی صفائی اور وسعت قلبی معلوم ہوتی ہے، اور ان میں اختلاف وتشاجر کے بجائے اعتماد و محبت کا یقین ہوتا ہے۔

حضرات طلحہ و زبیر و معاویہ رضی اللہ عنہم اور اہلِ شام کا اقرار

علی ؓ کو اس کا وہم و گمان نہیں تھا کہ معاویہ ؓ اور اہل شام میری بیعت سے الگ ہیں اور نہ طلحہ ؓ و زبیر ؓ کی طرف سے یہ خیال تھا کہ وہ میرے مخالف ہیں، بلکہ ان دونوں حضرات اور ان جیسے بعض دوسرے حضرات کے بارے

میں خیال تھا کہ کسی امرِ دینی کی وجہ سے فی الحال انہوں نے بیعت نہیں کی ہے اور بعد میں کرلیں گے، علی رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہونے کے بعد جب پہلا موسم حج آیا تو حضرات طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کے امیر ہونے کی حیثیت سے ان سے حج کی اجازت طلب کی، آپ نے ان کو اجازت دی۔

[و حضر الموسم فستاذن الزبیر و طلحه علیاً فی الحج فاذن لهما] (اخبار الطوال ص : ۱۴۳)

’’اور موسمِ حج آیا تو زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے حج کی اجازت چاہی اور آپ نے ان کو اجازت دی‘‘۔ کیا معلوم تھا کہ مکہ جانے کے بعد صورت حال کچھ اور ہی ہوجائے گی ، اور معاملہ دوسرا رنگ اختیار کرلے گا ، بہرحال علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہونے کے بعد خلافت کے کاموں کو سکون و اطمینان سے انجام دینا اور مختلف بلاد و امصار میں عمال مقرر کرنا شروع کیا، اسی سلسلہ میں شام پر سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو عامل بنا کر روانہ فرمایا، جہاں معاویہ رضی اللہ عنہ عہد فاروقی سے لے کر عہد عثمانی (اٹھارہ انیس) تک عامل رہ چکے تھے، سہل رضی اللہ عنہ شام کے ارادے سے نکلے، اور جب تبوک میں پہنچے جو شمالی سرحد ہے تو:

[استقبله خیل المعاویة فردوه فانصرف الی علی ، فعلم علی رضی الله عنه عند ذلک ان معاویة قد خالف ، وان اهل الشام بایعوه] (الاخبار الطوال ص :۱۴۲-۱۴۳)

’’معاویہ رضی اللہ عنہ کے سواروں نے ان کو روکا ، اور واپس کیا ، چنانچہ وہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس چلے آئے ، اس وقت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی مخالفت کی ہے، اور اہل شام نے ان سے بیعت کرلی ہے‘‘۔

واقعہ صفین سے پہلے ایک مرتبہ معاویہ رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے کہ ایک آدمی نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ السلام یا امیر المومنین! معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے جواب دیتے ہوئے علی رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت کے مقابلہ میں اپنی امامت و خلافت کے الفاظ سن کر اس آدمی سے فرمایا:

[وعلیک من انت الله ابوک فقد روعتنی بتسلیمک علی بالخلافة قبل ان انالها فقال انا الحجاج بن خزیمة بن الصمة] (الاخبار الطوال ص :۱۵۶)

”وعلیک السلام، تم کون ہو؟ تم نے میرے خلافت پانے سے پہلے ہی مجھے خلافت کا سلام (السلام علیک یا امیر المومنین) کر کے الجھن میں ڈال دیا، اس نے کہا، میں حجاج بن خزیمہ بن صمہ ہوں“۔

حجاج بن خزیمہ نے اثنائے گفتگو میں یہ بھی کہا کہ علی رضی اللہ عنہ کو آپ کا غصہ ہی راضی کر سکتا ہے، اور وہ شام چھوڑ کر صرف عراق کی حکومت پر راضی نہیں ہو سکتے، اور آپ تو عراق چھوڑ کر صرف شام کی حکومت پر راضی ہو سکتے ہیں۔ اس کی ان باتوں کو سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بڑا رنج ہوا:

[فضاق معاوية بما اتاه به الحجاج بن خزيمة ذوعا] (اخبار الطوال ص :۱۵۷)

”حجاج بن خزیمہ کی ان باتوں سے معاویہ رضی اللہ عنہ منقبض ہو گئے“۔

اگر علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ہر طرح کامل و مکمل اور بیعت صحیح نہیں تھی تو ان کے مد مقابل معاویہ رضی اللہ عنہ بھلا اپنے ایک آدمی سے اس طرح کی بات فرما سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت کو کامل و مکمل تسلیم کر کے ہی ان سے قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرتے تھے، اور ان کا تمام تر اعتراض اس معاملہ میں تاخیر کے باعث تھا، اور اسی نقطۂ نظر سے وہ گفتگو کرتے تھے، اس میں خلافت و بیعت کا کوئی انکار نہیں تھا، جیسا کہ علامہ ابن خلدون مقدمہ میں لکھتے ہیں:

[ولقد كان معاوية اذا صرح بملامة انما يوجهها عليه فى سكوته فقط] (ص :۱۷۸-۱۷۹)

”جب معاویہ رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ پر صریح ملامت کرتے تو اسے علیؓ کے دمِ عثمانؓ سے سکوت پر محمول کرتے، اور اسی کو وجہ قرار دیتے“۔

خود شام میں عبّاد و زہّاد اور ان کے ہم نواؤں کا ایک بڑا طبقہ تھا، جو علی الاعلان علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق تسلیم کر کے ہر طرح سے ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا، چنانچہ جنگ صفین کے موقع پر جب عام اہلِ شام نے علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی نصرت کا ارادہ کیا تو وہاں کے عبّاد و زہّاد نے اس کے خلاف اپنے نقیب و ترجمان کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا، اور اپنے جذبات کو برملا اظہار کیا:

[اقبل ابو مسلم الخولانی وکان من عبّاد اهل الشام حتیٰ قدم علی معاویه فدخل علیه

فی الناس من العبّاد فقال له یا معاویة قد بلغنا انک تهمّ بمحاربة علی بن ابی طالب فکیف تنادیه ولیست لک سابقته] (اخبار الطوال ص :۱۶۴)

’’ابومسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ جواہل شام کے عبّا دوزہّا د میں سے تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس عابدوں کی ایک جماعت لے کر آئے اورکہااے معاویہ! ہمیں معلوم ہواہے آپ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے جنگ کاارادہ کررہے ہیں، آپ کیسے ان کا مقابلہ کرتے ہیں، حالانکہ آپ کوان جیسی سابقیت فی الاسلام حاصل نہیں ہے‘‘۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے عثمان رضی اللہ عنہ کی بات کی، ابومسلم خولانی نے کہا کہ اس کا معاملہ خط وکتابت سے طے کرلیجئے، لائیے میں آپ کاخط لے کرعلی رضی اللہ عنہ کے پاس جاتا ہوں، چنانچہ وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا خط لے کرعلی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضرہوئے اورخط دینے کے بعداثنائے گفتگومیں فرمایا:

[یا ابا الحسن انک قد قمت بامرو ولیته ، و واللہ ما نحب انه لغیرک ان اعطیت الحق من نفسک ، ان عثمان رضی اللہ عنه قتل مظلوماً فادفع الینا قتلته وانت امیرنا فان خالفک احد من الناس کانت ایدینا ناصرة لک شاهدة ، وکنت ذا عذر وحجة] (اخبار الطوال ص : ۱۶۵)

’’اے ابوالحسن! آپ امرخلافت کولے کراٹھے ہیں، اوراس کے والی ہوئے ہیں، اوراللہ کی قسم ہم اسے آپ کے علاوہ کے لیے پسندنہیں کرتے، بشرطیکہ آپ خودانصاف کیجئے عثمان رضی اللہ عنہ ظلماً شہید کئے گئے، آپ ان کے قاتلوں کوہمارے حوالے کردیں، اورآپ ہمارے امیرہیں، اگراس پربھی کوئی آدمی آپ کامخالف ہوگاتوہمارے ہاتھ آپ کے مددگار ہوں گے، اورہماری زبانیں آپ کے لیے گواہ ہوں گی، اورآپ کے لیے معذرت اوردلیل ہوں گی‘‘۔

اس کے بعدعلی رضی اللہ عنہ نے ابومسلم خولانی کواپنے پاس ٹھہرایا، اورجب صبح کی نماز کے لیے مسجد میں ان کولے کرگئے تو دیکھاکہ دس ہزارسے زیادہ ہتھیاربندموجودہیں اورسب کے سب کہتے ہیں کہ ہم سب قاتل عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حالت دیکھ کرخودابومسلم خولانی نےعلی رضی اللہ عنہ سے کہا:

[انی لاری قوماً مالک معهم امر واحسب انه بلغهم الذی قدمت له ففعلوا ذلک خوفاً

من ان تدفعهم الی] (اخبار الطوال ص :١٥٦)

”میں ایسی جماعت کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ کا ان کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ ان کو پتہ چل گیا ہے کہ میں کس کام کے لیے آیا ہوں، اور انہوں نے اس ڈر سے یہ مظاہرہ کیا ہے کہ آپ ان کو کہیں میرے حوالے نہ کر دیں“۔

سب سے پہلے جنگ جمل میں عبّاد وزہّاد اور مشائخ دین نے علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے ہوئے شامی فوجوں سے مقابلہ کیا، چنانچہ عین معرکہ کا واقعہ ہے کہ:

[و قاتل عمرو بن الحمق وكان من عبّاد اهل الكوفة معه النساک قتالا شديدا فضرب بسيفه حتی انثنی ثم انصرف الی اخيه رياح فقاله له يا اخی ما احسن ما نصنع اليوم ان كانت الغلبة لنا] (ص ١٥٢)

”اور عمرو بن حمق نے جو کہ کوفہ کے عابدوں میں سے تھے، اور ان کے ہمراہ عابدوں اور زاہدوں کی ایک جمیعت تھی، سخت جنگ کی، اور اپنی تلوار سے اس قدر مارا کہ وہ مڑ گئی، پھر وہ اپنے بھائی ریاح کے پاس گئے، اور کہنے لگے کہ اے بھائی آج ہم لوگ کتنا اچھا کام کر رہے ہیں، اگر فتح ہماری ہو“۔

جنگ جمل اور صفین میں امت کے عبّاد وزہّاد شام کے ہوں یا کوفہ کے سب علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک تھے، اور اسے نصرت حق سمجھ کر اچھا کام سمجھتے تھے، اور اس پر نہایت خوش تھے، امت کے متقیوں اور عابدوں کا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا اس کام کو عبادت ثابت کر رہا ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر پورا عالم اسلام مجتمع تھا

واقعہ یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پورے عالم اسلام پر تھی، اور شام کے صوبہ کے سوا پوری اسلامی دنیا ان کو اپنا امام و خلیفہ تسلیم کرتی تھی، ان میں کسی قسم کی کوئی کمی یا خرابی نہیں پائی جاتی تھی، معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا بھی ان کو خلیفہ برحق تسلیم کرتے ہوئے صرف عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بارے میں ان سے اختلاف کرتے تھے، اور یہی اختلاف آگے چل کر جمل وصفین کی شکل میں ظاہر ہوا، اور دوسرے نامناسب حالات پیش آئے۔ چنانچہ واقعہ صفین سے پہلے علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور لکھا کہ یا تو بیعت واطاعت کریں، یا پھر جنگ کے

لیے تیار ہوجائیں، جس وقت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے ان کے یہاں اہل شام کے سربرآوردہ لوگ موجود تھے، ان کی موجودگی میں جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہتے ہوئے خط دیا:

[هذا كتاب على اليک والى اهل الشام يدعوكم الى الدخول فی طاعته ، فقد اجتمع له الحرمان والمصران والحجازان ، واليمن والبحران ، وعمان واليمامة ، ومصر ، فارس والجبل ، وخراسان ، ولم يبق الا بلادكم هذه ، وان سال عليها واد من اوديته غرقها] (اخبار الطوال ص : ۱۵۸)

''علی رضی اللہ عنہ کا یہ خط آپ اور اہل شام کے نام ہے وہ تم لوگوں کو اپنی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں، کیونکہ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، حجاز، یمن، بحرین، عمان، یمامہ، مصر، فارس، جبل خراسان کے لوگ علی رضی اللہ عنہ پر متفق ہو چکے ہیں، اور تمہاری بستی کے علاوہ کوئی جگہ باقی نہیں ہے، حالانکہ اگر اس پر علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیلاب آ جائے تو اسے غرق کر دے گا''۔

معاویہ رضی اللہ عنہ اور تمام اہل دربار نے جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سنیں، اور بغیر کسی انکار کے خاموش رہے، پھر معاویہ رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر اپنے مشیروں سے رائے مشورہ کیا، اور جنگی تیاری ہوئی۔

ایک اور نہایت معتبر شہادت

صفین سے پہلے ہی عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اپنے خاندان کو لے کر اور فتنہ سے الگ ہو کر فلسطین کے ایک گمنام گوشہ میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

[وكان مقيماً فی ضيعة له من حيز فلسطين قد اعتزل الفتنة] (اخبار الطوال ص : ۱۵۹)

''عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فلسطین کی حدود میں اپنی ایک زمین میں مقیم تھے، فتنہ سے الگ تھلگ ہو گئے تھے''۔

جب علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جریر رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تحریر لے کر گئے، تو انہوں نے خاص طور سے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا، وہ اپنے دونوں صاحبزادوں عبداللہ رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر حاضر ہوئے۔

[فسافرو معه ابناه عبد الله و محمد حتىٰ قدم على معاوية] (اخبار الطوال ص : ۱۵۹)

’’عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ اور محمد معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے‘‘

معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے تین اہم معاملات رکھے، جن میں سے ایک علی رضی اللہ عنہ کا یہ خط تھا:

[اما بعد فقد لزمک ومن قبلک من المسلمین بیعتی وانا بالمدینه وانتم بالشام لانه بایعنی الذین بایعوا ابا بکر و عمر وعثمان رضی الله عنهم فلیس للشاهد ان یختار ولا للغائب ان یرد ، وانما الامر فی ذالک للمهاجرین والانصار فاذا اجتمعوا علی رجل مسلم فسموه اماماً ، کان ذلک الله رضیً فان خرج من امرهم احد لطعن فیه او رغبة رد الی ما خرج منه فان ابی قاتلوه علیٰ اتباعه غیر سبیل المومنین ، وولاه الله ما تولی و یصله نار جهنم وساءت مصیرا۔ فادخل فیما دخل فیه المهاجرون والانصار ، فان احب الامور فیک و فیمن قبلک العافیة فان قبلتها و الا فاذن بحرب ، وقد کثرت فی قتلة عثمان فادخل فیما دخل فیه الناس ثم حاکم القوم الیّ احملک وایّاهم علی ما فی الکتاب الله وسنة نبیّه ، فاما التی تریدها فانما هی خدعة الصبی عن الرضاء] (اخبار الطوال ص : ۱۵۹)

’’امّا بعد! آپ پر اور جو لوگ آپ کی طرف ہیں ان سب پر میری بیعت لازم ہے، حالانکہ میں مدینہ میں ہوں اور آپ لوگ شام میں ہیں، کیونکہ میری بیعت ایسے لوگوں نے کر لی ہے جنہوں نے ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے بیعت کی تھی، اس کے بعد نہ حاضر کو اختیار ہے کہ دوسرا امام چنے، اور نہ غائب کو اختیار ہے کہ اس بیعت کو ردّ کرے، اس بارے میں معاملہ مہاجرین وانصار پر موقوف ہے، جب انہوں نے ایک مسلمان آدمی پر اجتماع کر کے اسے امام کے نام سے پکارا تو یہ اللہ کی رضا کا معاملہ بن گیا، اب اگر کوئی آدمی ان کے اس معاملہ پر اعتراض کر کے یا اس سے اعراض کر کے باہر ہوگا تو اسی بیعت کی طرف لوٹایا جائے گا، جس سے باہر ہوا ہے۔ اس کے بعد اگر اس نے انکار کیا تو لوگ اس سے مومنوں کی راہ کے علاوہ راہ اختیار کرنے پر جنگ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کے عمل کے مطابق سزا دے گا، اور اسے جہنم کی آگ میں جلائے گا، اور جہنم کی آگ اس کا برا ٹھکانہ ہوگی۔ پس آپ بھی اس بیعت میں داخل ہو جایئے، جس میں مہاجرین وانصار داخل ہو چکے ہیں، کیونکہ آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے سب سے پسندیدہ چیز راحت و عافیت ہے، اگر آپ اسے منظور کرتے ہیں تو فبہا ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے

بارے میں بہت کچھ کیا ہے، اب جس امر میں سب لوگ داخل ہو چکے ہیں، آپ بھی داخل ہو جایئے، پھر قوم کا محاکمہ میرے پاس لایئے میں آپ کو اور ان سب کو کتاب اللہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آمادہ کروں گا، اور جو چیز آپ چاہتے ہیں وہ تو بچہ کے دودھ چھڑانے کا بہانہ ہے“۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کے اس خط کا حوالہ دیتے ہوئے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جریر رضی اللہ عنہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا یہ خط لے کر آئے ہیں، جس میں انہوں نے ہمیں اپنی بیعت میں داخل ہونے کی دعوت دی ہے، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہونے کو للکارا ہے، اس پر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں بیان کیا:

[اما علی بن ابی طالب فان المسلمین لا یساروں بینک و بینه]

”علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان ان کو اور آپ کو برابر نہیں سمجھتے“۔

یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

[انه ما لاء علی قتل عثمان واظهر الفتنة وفرق الجماعة]

”انہوں نے قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں مدد کی، اور فتنہ ظاہر کیا اور جماعت میں تفریق ڈالی“۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان کی اس بات کا جواب دیا:

[انه وان کان کذالک فلیست لک مثل سابقته وقرابته] (اخبار الطوال ص :۱۶۰)

”واقعہ یہ ہے کہ ان کے ایسا ہونے کے باوجود آپ کو ان کے جیسی اسلام لانے میں اولیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت نہیں ہے“۔

علی رضی اللہ عنہ کے اس خط اور معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو کے بعد یہ باتیں واضح طور پر سامنے آجاتی ہیں:

(۱) مہاجرین وانصار کے بیعت میں عام طور سے داخل ہونے سے بیعت پوری ہو چکی تھی اور اب اس کے بعد انکار کا کوئی موقع نہیں تھا۔ بے شک ان سے پہلے اختلاف کا حق تھا۔

(۲) علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کو اجتماعی طور پر کتاب وسنت کی روشنی میں طے کرنا چاہتے تھے۔ ان

کے نزدیک اس میں گروہ بندی مفید نہ تھی۔ [1]

(۳) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی فریقین سے الگ ہو گئے تھے، اور اپنے بال بچوں کو لے کر ایک گمنام مقام پر چلے گئے تھے۔

(۴) معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرفداروں کو حق کا پورا پورا اعتراف واقرار تھا، اور وہ علی رضی اللہ عنہ کی ہر طرح برتری وافضلیت کو اپنی نجی مجلسوں میں تسلیم کرتے تھے۔

(۵) معاویہ رضی اللہ عنہ بھی علی رضی اللہ عنہ جو نکیر کرتے تھے یا ان کے خلاف ہو گئے تھے، اس کی وجہ صرف علی رضی اللہ عنہ کی قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں اُن کے علم کے مطابق مدد تھی، جس کا انکار خود علی رضی اللہ عنہ کرتے تھے۔

شامیوں کی شرارت اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجبوری

اسی سلسلہ میں ایک اہم معاملہ یہ ہے کہ اس کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی رائے سے اہل شام کے سردار وقائد شرجیل بن سمط کندی کو سربراہ بنا کر اہل شام کو ایک معاملہ پر متفق کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مگر شامیوں کی ضد اور ہٹ دھرمی سے معاویہ رضی اللہ عنہ عاجز و مجبور ہو گئے۔ اور امن وصلح کی یہ تدبیر ناکام ہو گئی۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے شرجیل بن سمط کندی کو بڑے جاہ جلال کے ساتھ بلایا کہ اس کے ذریعہ اہل شام کو امن وصلح کی طرف لایا جائے، مگر شرجیل نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے آتے ہی نہایت غضبناک لہجہ میں کہا:

[ابى الناس الا ابن ابى طالب قتل عثمان والله لئن بايعته لنخرجنك من الشام فقال معاوية ما كنت لا خالف امركم وانما انا واحد منكم]

”لوگ ہر بات کا انکار کر کے صرف اس بات پر مصر ہیں کہ ابن ابی طالب ہی نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے، اللہ کی قسم اگر آپ نے ان کی بیعت کی تو ہم آپ کو ضرور بالضرور شام سے نکال باہر کریں گے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تم لوگوں کی بات کی مخالفت نہیں کر سکتا میں تم لوگوں ہی میں سے ایک آدمی ہو“۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سن کر شرجیل نے کہا:

[فاردد هذا الرجل الى صاحبه يعنى جرير فعلم عند ذلك معاوية ان اهل الشام مع شرجيل]

’’جریر کو میرے حوالے کرو، اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ اہل شام شرجیل کے ہم نوا بن گئے ہیں‘‘ (اخبار الطوال ص:۱۶۱)

معاویہ رضی اللہ عنہ نے حالات کا اندازہ لگانے کے بعد شرجیل سے کہا کہ یہ معاملہ عوام کی رضامندی اور رائے سے ہوسکتا ہے، تم شام کے شہروں میں جاؤ اور لوگوں کو خبر دو کہ ہم لوگ اپنے خلیفہ کے خون کا بدلہ لینے والے ہیں، اور ان سے نصرت و امداد کی بیعت لو، چنانچہ شرجیل شام کے ایک ایک شہر میں گیا اور لوگوں میں خوب پروپیگنڈا کیا، کہ علی رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے، اور اس پر علی رضی اللہ عنہ سے جو لوگ خفا ہوئے ان کو انہوں نے قتل کیا، اور ان کی زمین پر قبضہ کرلیا اور شام کے علاوہ کوئی جگہ ان کے قبضے سے خالی نہیں رہ گئی، وہ اپنی تلوار اپنے کندھوں پر لئے ہوئے موت کی شدتوں میں گھستے چلے جارہے ہیں، اور شام کا رُخ کیے ہوئے ہیں، کیونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ بڑا دشمن ان کے نزدیک کوئی نہیں ہے، ایسی حالت میں تم لوگ خلیفہ مظلوم کے مطالبۂ دم کے لیے کھڑے ہوجاؤ۔

شرجیل کی اس عام تحریک اور پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، البتہ شام کے علاقہ حمص کے عبّاد وزہّاد شرجیل کے پھندے میں نہیں آسکے، اور انہوں نے اپنے گھروں اور مسجدوں کو نہیں چھوڑا:

[فاجابه الناس كلهم الا نفر من اهل حمص نساكا فانهم قالوا نلزم بيوتنا و مساجدنا وانتم اعلم]

’’تمام لوگوں نے شرجیل کی آواز پر لبیک کہا البتہ حمص کے چند افراد نے انکار کیا اور کہا کہ ہم اپنے گھروں اور اپنی مسجدوں میں رہیں گے، تم لوگ اس معاملہ کو زیادہ جانتے ہو‘‘۔

جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل شام کا رنگ بے رنگ دیکھا، اور شرجیل سے ان کی بیعت کا حال معلوم کرلیا تو مجبوراً علی رضی اللہ عنہ کے سفیر جریر رضی اللہ عنہ سے کہا جاؤ اور کہہ دو کہ میں اور اہل شام ان کی بیعت نہیں کر سکتے۔

[فلما ذاق معاوية اهل الشام ، وعرف مبايعتهم له قال لجرير الحق بصاحبك واعلمه

انی واهل الشام لا نجيبه الى البيعة] (الاخبار الطوال ص ١٦٢)

’’جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل شام کو دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ انہوں نے شرجیل کی بیعت کر لی ہے تو مجبوراً جریر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اپنے صاحب (علی رضی اللہ عنہ) کے پاس جا کر ان کو خبر کرو کہ میں اور اہل شام ان کی بیعت کو قبول نہیں کر سکتے‘‘۔

اس واقعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ شامیوں سے کس قدر مجبور ہو گئے تھے، اور صلح و مصالحت اور امن و امان کے لیے تیار ہو جانے کے باوجود اہل شام کی ضد اور شرارت کے باعث نہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر سکے، اور نہ فتنہ کے فرو کرنے کرانے میں کامیاب ہو سکے ،مؤلف (محمود احمد عباسی) نے بار بار علی رضی اللہ عنہ کو سبائیوں کے ہاتھوں مجبور و معذور ہو جانے کا پروپیگنڈا کیا ہے مگر معاویہؓ کا شامیوں کے ہاتھوں اس درجہ مجبور ہو جانے کو بیان نہیں کیا*۔

واقعہ یہ ہے کہ آخر میں دونوں شریروں اور فتنہ پروروں کا زور ہو گیا تھا۔ اور وہ معاملہ پر غلبہ حاصل کر کے صالح نیتوں کے لیے حجاب بن گئے تھے ،صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سبائیوں کے پردے میں مطعون کرنا ، اور ان پر الزام دینا ، اور شامیوں کی ان حرکتوں کو چھپاتے ہوئے سراہنا دیانتداری نہیں، جانبداری ہے، جو بے لاگ محقق کے لیے کسی طرح زیبا نہیں ہے۔

[*] **امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل شام نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک اور ظالم ٹھہرایا۔**

قال ابن تيمية رحمه الله : إن قال قائل : إن عليا بدأهم القتال؟ قيل له : وهم أولا امتنعوا عن طاعته ، ومبايعته ، وجعلوه ظالمًا مشاركاً في دم عثمان ، وقبلوا عليه شهادة الزور. (منهاج السنة : ٤١٠/٤) .

قلت : أشيع عند أهل الشام أن عليّا رضي بقتل عثمان ـ

وراجت هذه الإشاعة عند أهل الشام لأربعة أمور :

١- عدم قتل قتلة عثمان.

٢- معركة الجمل.

٣- ترك المدينة والسكن بالكوفة ، والكوفة هي معقل قتلة عثمان.

٤- أن في جيش علي من هو متهم بقتل عثمان.

لهذه الأمور الأربعة وقع الشك عند أهل الشام (عند الجهلة منهم) أنّ لعلي يدا في قتل عثمان رضى الله عنهما ، وليس لعلي يد بل كان يلعن قتلة عثمان ، فإن قيل : هذا وحده لم يبح قتالهم . قيل : إنه ما كان يجوز لهم أن يقاتلوا عليا رضى الله عنه لكونه عاجزا عن قتل قتلة عثمان وتركه إما متأولا أو مذنبا ، مبايعة على كل حال أصلح في الدين وأنفع للمسلمين.

(منهاج السنة ـ للشيخ الإسلام إمام ابن تيمية رحمه الله ـ ٤/١٤١ ـ) . (قال الشيخ عثمان الخميس فى كتابه ـ حقبة من التاريخ ما بين وفاة النبي صلي الله عليه وسلم إلى مقتل الحسين رضي الله عنه ٦١ هـ ـ للشيخ عثمان الخميس ـ (ص : ١٨٨-١٨٩)

اگر کوئی کہنے والا کہے کہ سیدنا علی ؓ نے ان سے لڑائی میں پہل کی تو اسے جواب دیا جائے گا کہ انہوں نے سیدنا علی ؓ کی بیعت اور ان کی اطاعت سے انکار کرنے میں پہلوتہی کی اور آپ کو سیدنا عثمان ؓ کے قتل میں شریک اور ظالم ٹھہرایا اور ان کے متعلق جھوٹی شہادت قبول کی۔ کیونکہ اہل شام میں یہ بات مشہور کر دی گئی تھی کہ سیدنا علی ؓ قتل عثمان ؓ پر راضی تھے۔ اور اہل شام کے ہاں یہ جھوٹی شہادت مندرجہ ذیل چار وجوہات کی بنا پر سند قبولیت حاصل کر گئی تھی۔

(۱) امیر المؤمنین سیدنا عثمان ؓ کے قاتلین سے انتقام نہ لینا۔

(۲) جنگ جمل۔

(۳) مدینہ منورہ کو چھوڑ کر کوفہ کو دار الخلافہ بنانا، جبکہ کوفہ، قاتلان سیدنا عثمان ؓ کی چھاؤنی تھی۔

(۴) سیدنا علی ؓ کے لشکر میں ان لوگوں کا موجود ہونا، جن پر قتل سیدنا عثمان ؓ کی تہمت تھی۔

مذکورہ بالا چاروں وجوہات کی بنا پر شام کے (ان پڑھ) عوام کو شک ہو گیا کہ سیدنا عثمان ؓ کے قتل میں سیدنا علی ؓ کا

ہاتھ ہے، حالانکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ان کے قتل میں کوئی ہاتھ نہ تھا، بلکہ آپ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ صرف اتنی بات پر (شامیوں کے خلاف) لشکر کشی جائز نہ تھی (بلکہ ان کی غلط فہمی دور کرنی چاہیے تھی تو جواب یہ دیا جائے گا کہ:

اہل شام کے لیے بھی جائز نہ تھا کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس بنا پر لڑتے کہ وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو پکڑنے میں بے بس ہیں، بلکہ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کی طاقت رکھتے بھی ہوتے اور انہیں تاویل کی بنا پر یا خطا پر چھوڑ بھی دیتے تو ان اس کوتاہی پر جماعت میں تفریق ڈالنے اور ان کی بیعت سے انکار کرنے کی گنجائش نہ تھی بلکہ آپ کی بیعت، ہر حال میں دین الٰہی کے لیے درست ترین اور مسلمانوں کے لیے نفع مند تھی۔

امام ابن تیمیہ نے یہ سب کچھ اپنی طرف سے نہیں لکھا بلکہ یہ تاریخی حقائق ہیں جسے شیعہ سنی مصادر نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے جو کہ امام ابن تیمیہ کے بیان کی توثیق اور سچائی کو بیان کرر ہے ہیں اخبار الطوال میں ابوحنیفہ دینوری لکھتے ہیں:

[فدعا يزيد بن اسد، وبسر بن ابى ارطاه، وسفيان بن عمرو، ومخارق بن الحارث، وحمزه بن مالك، وحابس بن سعد، وغير هؤلاء من اهل الرضا عند شرحبيل بن السمط، فوطنهم له على طريقه، ثم كتب اليه يأمره بالقدوم عليه، فكان يلقى الرجل بعد الرجل من هؤلاء في طريقه، فيخبرونه ان عليا مالا على قتل عثمان، ثم اشربوا قلبه ذلك ------ الخ].

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں بھی حلقۂ اطاعت میں شامل ہونے اور بیعت کر لینے کی دعوت دیں اور اگر وہ انکار کریں تو انہیں جنگ کے لیے تیار رہنے کا کہہ دیں۔

اس پر اشتر نے کہا: ”کسی اور کو بھیجئے مجھے ان کی پائیداری پر بھروسہ نہیں“۔

مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اشتر کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ بہر حال جریر رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خط لے کر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف چل دیئے۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے تو اس وقت ان کے پاس کئی شامی رؤسا موجود تھے۔ انہوں نے خط دے دیا اور کہا:

”یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خط ہے آپ کے اہلِ شام کے نام۔ وہ آپ کو حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

دونوں حرم، کوفہ و بصرہ، دونوں حجاز، یمن، بحرین، عمان، یمامہ، مصر، فارس، جبل اور خراسان سب اجتماعی طور سے انہیں خلیفہ مان چکے ہیں۔ آپ کے اس علاقے کے سوا اور کوئی علاقہ باقی نہیں اور اگر سیدنا علی ؓ کی سیّال وادیوں میں سے ایک وادی بھی شام کی طرف بہہ نکلی تو یہ ڈوب جائے گا‘‘۔

سیدنا معاویہ ؓ نے خط کھولا اور پڑھا ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندے علی امیر المومنین (ؓ) کی جانب سے معاویہ بن ابی سفیان کے نام - اما بعد! آپ پر اور جن کے آپ نمائندے ہیں ان پر میری بیعت لازم ہے۔ اس لئے کہ میں مدینہ میں ہوں اور آپ لوگ شام میں ہیں۔ اس لیے کہ میری بیعت اُنہی لوگوں نے کی ہے جنہوں نے ابوبکر ؓ، عمر ؓ اور عثمان ؓ کی بیعت کی تھی۔ بعد ازاں نہ کسی حاضر کو کوئی حقِ انتخاب حاصل رہا اور نہ کسی غائب کو حق تردید۔ یہ معاملہ مہاجرین وانصار کی رائے ہی سے فیصل ہوتا ہے اور جب مہاجرین وانصار کسی مرد مسلم کے ضمن میں متفق ہو جائیں اور اُسے امام قرار دے دیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس معاملے میں خالصتاً رضائے الٰہی پیش نظر ہوتی ہے تو پھر کسی کو ان کے فیصلے سے کسی ناپسندیدگی یا ناگواری کے باعث سرتابی کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو حلقۂ اطاعت سے باہر قدم رکھے اُسے واپس لایا جاتا ہے۔ اور جو واپس آنے سے انکار کرے اس سے جنگ واجب ہے اس لیے کہ اس نے وہ راہ اختیار کی جو مومنوں کی راہ نہیں ہے۔ اللہ اسے اس کے کئے کا ذمہ دار قرار دے کر جہنم رسید کرتا ہے اور جہنم بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ لہٰذا آپ بھی اس امر پر متفق ہو جائیں جس پر مہاجرین وانصار متفق ہیں۔ آپ کے ضمن میں بھی اور ان کے ضمن میں بھی جن کے نمائندے آپ ہین عافیت وسلامت ہی ہر شے سے زیادہ بہتر ہے آپ یہ بات مان لیں تو فبہا ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ آپ نے قاتلین عثمان کے بارے میں بہت زیادہ واویلا مچایا ہے۔ پہلے آپ دوسروں کے ہمراہ حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں اور پھر قوم سے کہیں کہ مجھ سے محاکمہ کرے۔ میں آپ کو اور انہیں احکام قرآن اور سنت نبوی کی راہ پر ڈال دوں گا۔ رہی وہ بات جو آپ چاہ رہے ہیں تو یہ بچے کو دھوکا دے کر دودھ پینے سے روک دینے کے مترادف ہے‘‘۔

اس پر سیدنا معاویہ ؓ نے اپنے کنبے کے اکابر کو جمع کر کے اپنی صورتحال کے ضمن میں مشورہ طلب کیا۔ ان کے بھائی عتبہ بن ابی سفیان نے کہا: ’’عمرو بن عاص ؓ ان دنوں اپنی جاگیر میں جو فلسطین کی حدود میں شامل تھی مقیم تھے۔ انہوں نے فتنہ وفساد میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ چنانچہ معاویہ ؓ نے لکھا:

’’طلحہ ؓ، زبیر ؓ، اور ام المومنین ؓ کے معاملہ میں علی کی کاروائی کا آپ کو علم ہوگا۔ ابن جریر بن عبداللہ ؓ

آئے ہیں کہ ہم سے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت لیں۔ میں نے اپنا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ آئیں، میں اس[1] معاملے میں آپ سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ والسلام‘‘۔

اس پر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے رخت سفر باندھا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے۔ عمرو رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان ضرورت ہے۔ چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا:

’’ابو عبداللہ ہمیں تین معاملات درپیش ہیں جن کے مقابلے میں نہ بھاگتے بنتی ہے نہ ٹھہرتے‘‘۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟‘‘۔

جواب دیا: ’’سب سے پہلا معاملہ یہ ہے کہ محمد بن ابو حذیفہ قید خانہ توڑ کر اپنی جمعیت کے سمیت مصر کی جانب مفرور ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہمارے شدید ترین دشمنوں میں سے ہے۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ قیصر روم نے لشکر جمع کر لیے ہیں اور شام پر حملہ کر کے ہم سے لڑنا چاہتا ہے۔ تیسرا معاملہ یہ ہے کہ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے قاصد بن کر آئے ہیں اور ہم سے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا مطالبہ کرتے ہیں اور بصورتِ انکار جنگ کے لیے تیار ہو جانے کے دھمکی دیتے ہیں‘‘۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ’’ابن حذیفہ زندان سے نکل کر اپنے ساتھیوں سمیت مفرور ہو گئے ہیں اور یہ معاملہ آپ کی پریشانی کا باعث ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ تعاقب میں سواروں کے دستے روانہ کریں۔ اگر اس پر قابو پالیں تو فبہا۔ قابو نہ پاسکیں تو بہر حال وہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہچانے کا۔ رہا قیصر تو اسے اطلاع دے دیں کہ آپ کے پاس جتنے رومی قیدی ہیں آپ انہیں رہا کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی کریں کہ آپ صلح و آشتی کے طالب ہیں۔ وہ فوراً اس بات کو مان لے گا اور اتنی سی بات پر آپ سے راضی ہو جائے گا۔ مگر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا معاملہ جدا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان انہیں اور آپ کو برابر نہیں جانتے‘‘۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’مگر لوگوں کو قتل عثمان پر علی رضی اللہ عنہ نے ہی ابھارا۔ فتنہ اُنہی نے بپا کیا۔ جمعیت کو انہیں نے پریشان کیا ‘‘۔

عمرو رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ’’اگر انہوں نے آپ کے بقول یہ سب کچھ کیا بھی ہو تو جب بھی انہیں اسلام کے معاملے میں جو سبقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو قرابت حاصل ہے وہ آپ کو نہیں۔ تاہم بات یہ ہے کہ اگر میں آپ کی مدد کروں

اور آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو مجھے کیا ملے گا؟‘‘۔ [1]

معاویہؓ نے کہا: ’’جو آپ فرمائیں‘‘۔

عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا: ’’جب تک زمامِ اقتدار آپ کے ہاتھ میں رہے مصر کو میر القمہ قرار دے دیں‘‘۔

معاویہؓ ذرا اشش و پنج میں پڑ گئے پھر بولے: ’’اے ابو عبداللہ اگر میں چاہوں کہ میں آپ کو فریب دوں تو میں دے سکتا ہوں‘‘۔

عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا: ’’میرے جیسے شخص کو فریب نہیں دیا جا سکتا‘‘۔

معاویہؓ نے کہا: ’’ذرا میرے قریب آئیں ایک راز کی بات کرنا ہے‘‘۔

عمرو بن عاصؓ ان کے قریب ہوئے تو معاویہؓ بولے: ’’یہ ہے فریب حالانکہ اس وقت گھر میں میرے اور آپ کے سوا کوئی دوسرا موجود نہیں‘‘۔ پھر کہا: ’’کیا آپ جانتے ہیں کہ مصر بھی عراق کے ہم پلہ ہے؟‘‘۔

عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا: ’’یہ الگ بات ہے کہ مصر میرے حصے میں اُس وقت ہو گا جب دنیا آپ کے زیر نگیں ہو گی اور عراق آپ کو اس وقت ملے گا جب آپ علیؓ پر غلبہ حاصل کر لیں گے‘‘۔

معاویہؓ اس مسئلے میں پھر متامل ہوئے اور عمرو بن عاصؓ اٹھ کر جائے قیام کی طرف چلے گئے۔ اس وقت عتبہ نے معاویہؓ سے کہا: ’’کیا آپ کو یہ پسند نہیں ہے کہ مصر دے کر عمرو بن عاصؓ کو خرید لیں اور اس طرح ہنڈیا کا بہترین شوربا آپ کے حصے میں آ جائے۔ یعنی شام آپ سے کوئی نہ چھین سکے‘‘۔

معاویہؓ نے عتبہ سے کہا: ’’یہ رات ہمارے ہی یہاں بسر کرو۔ چنانچہ عتبہ نے رات وہیں بسر کی۔ جب معاویہؓ بستر پر لیٹ گئے تو عتبہ نے یہ شعر الاپنے شروع کر دیے۔

(۱) اے اس تلوار سے منع کرنے والے جو ابھی لہرائی بھی نہیں گئی تو یقیناً ریشم و پرنیاں کا دلدادہ ہو کر رہ گیا ہے۔

(۲) تو خود نازک و نرم میمنہ ہے جو دو تھنوں اور لمبی صوف میں پڑا عیش کر رہا ہے۔

(۳) تجھے نعمت میسر آ رہی ہے لہٰذا اُس نعمت کے دودھ کی اوّلین دھاروں سے بہرہ اندوز ہو اور جو دھار مشقت طلب ہے اس کو چھوڑ دے۔

(۴) تو نعمت کے ضمن میں حرص چھوڑ دے۔ دوسروں کو شریک کرنے سے مت کترا۔ آگ بھڑکا کہ کوئی سرما زدہ تاپ لے۔

(۵) مصر علی کا ہے یا ہمارا؟ بات یہ ہے کہ آج مصر پر وہی غالب ہوگا جو اس کی طرف پہلے متوجہ ہوگا۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ شعر سن لیے۔ لہٰذا صبح ہوئی تو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان کا مطالبہ مان لیا گیا۔ پھر اس ضمن میں دونوں کے مابین اقرار نامہ تحریر ہوگیا۔ اب معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے اپنے معاملے میں مشورہ طلب کیا اور کہا ''بتائیں کیا رائے ہیں؟''

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس بیعت سے متعلق اہلِ عراق کے احوال کو خوب ترین شخص کی طرف معلوم ہو چکے ہیں۔ میں آپ کو یہ رائے نہ دوں گا کہ آپ اہلِ شام کو اپنی خلافت کی طرف راغب کریں کیونکہ اس میں عظیم خطرات پوشیدہ ہیں۔ پہلے آپ اکابرِ شام کو اس ضمن میں اپنا ہم خیال بنائیں کہ علی رضی اللہ عنہ ہی نے لوگوں کو قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر اکسایا تھا۔ یہ بات ان کے دلوں میں خود راسخ کریں۔ یہ بھی جان لیں کہ اہلِ شام کا سرتاج شُرحبیل بن سِمط کندی ہے اُسے بلوائیں اور اس کی راہ پر جگہ جگہ ایسے آدمی متعین کر دیں جو اسے بتاتے جائیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ وہ آدمی ایسے ہونے چاہئیں جو اس کے نزدیک بااعتبار ہوں۔ یہ وہ کلمہ ہے جو اہلِ شام کو آپ کے حق میں متحد کر دے گا۔ پھر اگر یہ بات شرحبیل کے دل میں بیٹھ گئی تو کوئی چیز اسے نکال نہ سکے گی''۔

یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن اسد، بسر بن ارطاۃ، سُفیان بن عمرو، مُخارق بن حارث، حمزہ بن مالک، حابس بن سعد اور دیگر کئی ایسے افراد کو بلایا جو شرجیل کے نزدیک پسندیدہ لوگوں میں سے تھے اور انہیں اس کی راہ پر متعین کر دیا۔ ازاں بعد اسے لکھا کہ مجھ سے آکر مل جائیں۔ اب ہوا یہ کہ شرحبیل کو یکے بعد دیگرے جو بھی مل رہا ہے یہی کہے جا رہا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر اکسایا تھا۔ یہاں تک کہ بات اس کے دل میں پوری طرح جاگزیں ہوگئی۔

جب شرحبیل دمشق کے قریب پہنچا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اکابر دمشق کو اس کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے اس کا استقبال کیا، اس کے ساتھ بڑی تعظیم کی۔ ان تعظیم کرنے والوں میں سے بھی جس کے ساتھ شرحبیل ذرا تنہا ہوتا وہی اس کے کان میں یہ بات ڈال دیتا حتیٰ کہ جب وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو غصے سے بپھر رہا تھا۔ لہٰذا آتے ہی کہا ''سب لوگ مُصِر ہیں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر آپ نے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ہم آپ کو شام سے باہر نکال دیں گے۔

معاویہ ؓ نے جواب دیا: ’’میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا ہوں میں تو آپ ہی میں سے ہوں‘‘۔

شرحبیل نے کہا: ’’تو اس شخص کو یعنی جریر بن عبداللہ ؓ کو اس کے رفیق کی جانب واپس بھیج دیں‘‘۔

شرحبیل کی بات سے معاویہ ؓ پر یہ امر روشن ہو گیا کہ اہلِ شام اس کی پشت پر ہیں لہٰذا شرحبیل سے کہا: ’’آپ جس امت کا قصد کر رہے ہیں یہ اس وقت تک مناسب نہیں جب تک رضائے عامہ اس میں شامل نہ ہو۔ لہٰذا آپ ملک شام میں گھوم پھر کر لوگوں کو بتائیں کہ ہم اپنے خلیفہ کے خون کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ان سے مدد و معاونت کا عہد لیں‘‘۔

چنانچہ شُرحبیل نے شامی قصبات میں گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ آج یہ شہر کل وہ۔ ہر جگہ اس کا آوازہ یہی تھا ’’اے لوگو! عثمان ؓ کو علی ؓ نے قتل کر دیا۔ اس بات پر ایک جمعیت علی ؓ کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور علی ؓ سے لڑ گئی مگر علی ؓ نے اس جمعیت کو تہہ تیغ کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ فقط یہ ملک باقی رہ گیا ہے مگر اب علی ؓ تلوار کاندھے پر رکھے موت کے دریا میں کودیں گے اور تم تک آ پہنچیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے قتل پر معاویہ سے بڑھ کر اور کوئی قادر نہیں۔ لہٰذا اے لوگو! اپنے مظلوم خلیفہ کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہو‘‘۔

شُرحبیل کی بات پر سبھی نے لبیک کہا، البتہ اہل حمص کے ایک گروہ عباد و زہاد نے ہاں میں ہاں نہ ملائی۔

انہوں نے کہا: ’’ہم تو اپنے گھروں اور اپنی مسجدوں میں پڑے ہیں آپ جانیں اور آپ کا کام‘‘۔

جب معاویہ ؓ نے اہل شام کو رام کر لیا اور جان لیا کہ وہ اُن کی بیعت کر چکے ہیں تو اُنہوں نے جریر ؓ سے کہا: ’’اپنے رفیق کے پاس واپس چلے جائیں اور انہیں آگاہ کریں کہ میں اور اہلِ شام بیعت کے بارے میں ان کا حکم نہیں مانیں گے‘‘۔

اور پھر کعب بن جُعَیل کے یہ شعر علی ؓ کی طرف لکھ بھیج دیے:

(۱) میں دیکھ رہا ہوں کہ اہلِ شام اہلِ عراق کی حکومت کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ عراق کو شامیوں سے نفرت ہے۔

(۲) ہر ایک اپنے مقابل کے خلاف دل میں کینہ لیے ہوئے ہے اور اپنے اس بغض و کینہ کو اپنا دین جانتا ہے۔

(۳) انہوں نے کہا ہمارا امام علی ہے۔ ہم نے کہا ہم نے معاویہ بن ہند کو پسند کر لیا اور بس۔

(۴) انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ ہم نے کہا ہم اس خیال سے متفق نہیں ہم اطاعت نہ کریں گے۔

(۵) ہر شخص اپنی چیز پر راضی ہے۔ اپنی ہر گھٹیا شے کو اعلیٰ جانتا ہے۔

(٦) علی کے رضا جو کو علی میں اور کیا ملے گا ماسوا اس کے کہ ان نوعمروں کے گروہ کو اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔

(۷) نہ وہ راضی نہ ناراض، نا اصحاب امر سے اور نہ اصحابِ نہی میں سے۔

(۸) وہ اپنے خیر خواہ کو نہ دکھ دے سکتا ہے نہ مسرور کر سکتا ہے اور لازماً اس کے بعد بھی علی یہی کچھ رہے گا۔

جب علی ؓ نے یہ خط پڑھا تو نجاشی سے کہا کہ جواب دو۔

اُس نے کہا:

(۱) اے معاویہ جو شے ممکن نہیں اس سے دست کش ہو جاؤ۔ تم لوگ جس امر سے گریزاں ہوا سے اللہ نے لباسِ حقیقت میں جلوہ گر کر دیا ہے۔

(۲) اگر علی اہلِ عراق اور اہلِ حجاز کو لے کر تمہارے سروں پر آن پہنچے تو پھر کیا کرو گے؟

(۳) یہ وہ لوگ ہیں جو غبار کی تاریکی میں بھی نیزے مارتے چلے جاتے ہیں۔ خاک اُڑ رہی ہو مگر ان کی تلواریں خودوں پر برستی رہتی ہیں۔

(۴) انہی لوگوں نے طلحہ و زبیر اور دیگر عہد شکن لوگوں کی جمعیت کو مار بھگایا تھا۔

(۵) اگر تمہیں عراق کی حکومت پسند نہیں تو نہ ہو ہمیں ازل سے وہ بات پسند ہے جو تمہیں ناگوار گزرتی ہے۔

(٦) لہٰذا بنی وائل کے برادر قبیلے کعب سے کہہ دو اور دیگر اُن افراد سے بھی کہہ دو جو کبھی کبھی اپنی ناکارہ چیزوں کو بھی اعلیٰ فرض کر لیتے ہیں۔

(۷) کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم علی اور اس کے حامیوں کو معاویہ ابن ہند کا ہمسر قرار دے رہے ہو؟

جب جریر بن عبد اللہ ؓ علی ؓ کے پاس واپس آئے تو لوگوں نے ان پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے۔ چنانچہ جب وہ اشتر علی ؓ کے پاس اکھٹے ہوئے تو اشتر نے کہا: ”اللہ کی قسم جس غرض سے آپ نے ان

(جریر رضی اللہ عنہ) کو بھیجا تھا اگر مجھے بھیجتے تو میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا گلہ دبا دینے میں نرمی سے کام نہ لیتا۔ وہ کوئی دروازہ بھی ایسا نہ کھولنا چاہتا جسے میں بند کیے بغیر رہتا۔ میں اس کی ہر تدبیر کا تدارک پہلے سے سوچ لیتا“۔

جریر رضی اللہ عنہ بولے: ”تمہیں ان کے پاس جانے سے کون روکتا ہے“۔

اشتر نے کہا: ”اب تو آپ انہیں بگاڑ چکے ہیں اور واللہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ آپ ان کے پاس گئے ہی ان کی دوستی اور محبت حاصل کرنے تھے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی تیاریوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور میں ان کی فوجوں کی کثرت سے خائف کرتے ہیں۔ اگر امیر المومنین میرا کہنا مانیں تو آپ کو اور آپ جیسے دیگر مشکوک لوگوں کو زندان میں ڈال دیں اور جب تک خلافت کا معاملہ سیدھا نہیں ہو جاتا ہرگز رہا نہ کریں“۔

اشتر کی اس گفتگو سے جریر رضی اللہ عنہ کو بہت غصہ آیا۔ چنانچہ ایک شب وہ اپنے خانوادے کے کئی افراد کو ساتھ لے کر کوفے سے نکل گئے اور قرقیشیاء جا کے بس گئے۔ قرقیشیاء جزیرہ کا ایک ضلع ہے۔

علی رضی اللہ عنہ کو جب جریر کے اس طرح الگ ہو جانے کا بہت رنج ہوا۔ لہٰذا سوار ہو کر ان کے مکان پر پہنچے اور ان کی بیٹھک کو آگ لگوا دی۔ چنانچہ ابو ذرعہ بن عمرو جو جریر کے چچا زاد بھائی تھے باہر نکلے اور کہا ”مانا کہ وہ شخص (جریر) آپ کا قصور وار ہے مگر یہ مکان تو بہت سے ایسے لوگوں کا بھی مسکن ہے جنہوں نے آپ کا کوئی قصور نہیں کیا۔ آپ انہیں بھی ہراساں کر رہے ہیں“۔

اس پر علی رضی اللہ عنہ بولے: ”استغفر اللہ“ اور وہاں سے نکل کر جریر کے ایک اور ابن عم ثُویر بن عامر کے مکان میں چلے گئے۔ ثُویر علی رضی اللہ عنہ ہی کے ہمراہ مدینے سے کوچ کر کے آئے تھے۔ وہاں ذرا سی دیر رکے اور پھر لوٹ گئے۔

کہتے ہیں کہ جب علی رضی اللہ عنہ جنگ جمل سے فارغ ہوئے تو عبید اللہ بن عمر کو خوف لاحق ہوا کہ مبادا وہ اسے ہرمزان کے قتل کے بدلے میں قتل کرا دیں لہٰذا وہ کھسک کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا: ”اللہ نے عبید اللہ بن عمر کو ہمارے پاس بھیج کر ہمارے دلوں میں عمر بن خطاب کی یاد تازہ کر دی ہے“۔

پھر چاہا کہ وہ لوگوں میں اس امر کا چرچا کرے کہ خون عثمان رضی اللہ عنہ کے ذمہ دار رضی اللہ عنہ علی ہیں مگر اس نے انہوں نے انکار کر دیا۔ لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسے بے مصرف جان کے چھوڑ دیا مگر بعد میں پھر اس کی دالداری کی اور مقرب بنا لیا۔

کہتے ہیں کہ جب اہلِ شام نے معاویہ ؓ کی اعانت کرنے اور ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو ابو مسلم خولانی ان کے پاس عابدوں اور زاہدوں کے ایک گروہ کی معیت میں آئے۔ خود ان کا اپنا شمار بھی شام کے عبادت شعار افراد میں ہوتا تھا۔ انہوں نے آ کر کہا: ”اے معاویہ ؓ، ہم نے سنا ہے کہ آپ علی ؓ کے ساتھ جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں مگر آپ اُن کے مدمقابل کیونکر بن بیٹھے ہیں۔ آپ کو ان جیسی کون سی سبقتیں حاصل ہیں“۔

معاویہ ؓ بولے: ”میں یہ دعویٰ کب کر رہا ہوں کہ فضل و شرف کی رو سے میں علی ؓ کا ہم پایہ ہوں مگر کیا آپ نہیں جانتے کہ عثمان ؓ کو بے گناہ قتل کر دیا گیا“۔

انہوں نے کہا: ”ہاں“۔

کہا: ”تو پھر علی ؓ کو چاہیے کہ قاتلینِ عثمان ؓ کو ہمارے سپرد کر دیں، خلافت ہم ان کے سپرد کر دیں گے“۔

ابو مسلم نے کہا: ”آپ یہ بات علی ؓ کے نام تحریر کر دیں میں خود آپ کا خط لے کر جاؤں گا“۔

معاویہ ؓ نے خط لکھا:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے علی بن ابی طالب کے نام - سلام علیکم - میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں - اما بعد: خلیفہ عثمان آپ کے جوار میں قتل ہوئے یوں کہ آپ ان کے گھر میں بپا ہونے والے واویلا اور فریاد کو سن رہے تھے مگر آپ نے ان کی مدافعت نہ قولاً کی نہ فعلاً - اللہ کی قسم اگر آپ صدق دل سے ان کے معاملے میں دلچسپی لیتے اور لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر باز رکھتے تو ہمارے نزدیک آپ کا ہمسر کوئی نہ تھا۔ اور دوسری چیز جو آپ سے بدگمان کرتی ہے یہ ہے کہ آپ نے قاتلین عثمان کو اپنی پناہ میں لے رکھا ہے وہی لوگ آپ کے دست بازو ہیں۔ وہی لوگ آپ کے دست و بازو ہیں۔ وہی لوگ آپ کے مددگار اور راز دار ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ عثمان کے خون سے بری ہونے کے مدعی ہیں اگر یہ بات ٹھیک ہے تو قاتلینِ عثمان کو ہمارے سپرد کر دیں ہم قتلِ عثمان کے بدلے میں ان کو قتل کر دیں گے اور فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر آپ اور آپ کے ساتھی یہاں تلوار کے اور کسی شے کی توقع نہ رکھیں۔ قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہم قاتلینِ عثمان کو خشکی میں بھی ڈھونڈیں گے اور تری میں بھی تاآنکہ انہیں ہلاک کر دیں یا یہ کہ خود ہماری روحیں اللہ کے پاس جا پہنچیں۔ والسلام“۔

ابومسلم معاویہ رضی اللہ عنہ کا خط لے کر کوفہ پہنچے۔ علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خط پیش کر دیا۔ جب وہ خط پڑھ چلے تو ابومسلم نے ان سے کہا: ”اے ابوالحسن آپ نے ایک ذمہ داری سنبھالی ہے۔ آپ اس کے مستحق بھی ہیں۔ اللہ کی قسم ہم نہیں چاہتے کہ وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔ بشرطیکہ آپ اپنی طرف سے اس کا حق ادا کر دیں۔ کوئی شک نہیں عثمان رضی اللہ عنہ کو بے گناہ قتل کیا گیا ہے لہٰذا آپ ان کے قاتل ہمارے سپرد کر دیں اور ہمارے امیر بن جائیں۔ پھر کوئی ہاتھ آپ کے مخالف کارفرما ہو تو ہمارے ہاتھ آپ کے مددگار رہوں گے، ہماری زبانیں آپ کی گواہ ہوں گی، آپ اتمام حجت کر چکے ہوں گے۔ آپ کا عذر مقبول ہو چکا ہوگا“۔

علی رضی اللہ عنہ نے ابومسلم سے کہا: ”آپ کل صبح میرے پاس آئیں“ اور حکم دیا کہ انہوں نہایت عزت واحترام کے ساتھ رکھا جائے۔

اگلے روز صبح وہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس ملنے آئے۔ وہ اس وقت مسجد میں بیٹھے تھے۔ مگر دیکھا کہ کوئی دس ہزار سے زائد اشخاص پوری طرح مسلح ہیں اور پکار رہے ہیں ”ہم سب قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ ہیں“۔

اس پر ابومسلم نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ان پر آپ کا بس نہیں چل سکتا۔ میرا خیال ہے انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے پاس کس غرض سے آیا ہوں اور وہ یہ حرکت اس لیے کر رہے ہیں آپ کہیں ان کو میرے حوالے نہ کر دیں“۔

علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اس معاملے کو خوب چھان پھٹک کر دیکھا ہے۔ میری رائے میں ان کا آپ کے یا کسی اور کے سپرد کر دینا معاملے کو سلجھا نہیں سکتا۔ بیٹھیے میں آپ کے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ اور پھر لکھا:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: اللہ کے بندے امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاویہ بن ابی سفیان کے نام- امابعد! بھائی خولان آپ کا خط لے کر آئے۔ جس میں آپ نے مجھ پر عثمان رضی اللہ عنہ سے قطع رحم اور ان کے خلاف لوگوں کو اکسانے کا الزام لگایا ہے حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خود ہی اپنا دشمن بنا لیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض جان کے درپے ہوئے اور بعض ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ دیکھ کر میں اپنے گھر میں بیٹھ رہا اور عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے سے دست کش ہو گیا۔ رہا یہ کہ آپ ضرور مجھ ہی کو مجرم قرار دیں تو میں کیا لکھوں۔ جو جی میں آئے کہتے جائیے۔ رہا یہ کہ میں قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کو آپ کے سپرد کر دوں؟ تو میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا یہ مطالبہ اُس مقصد تک پہنچنے کا راستہ ہو گا جو آپ کے پیشِ نظر ہے۔ آپ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ ہرگز نہیں چاہتے۔ اللہ کی قسم اگر آپ

اپنی اس گمراہی اور تفرقہ پردازی سے باز نہ آئے تو آپ پر وہی کچھ نازل ہوگا جو ایک تفرقہ پرداز، سرکش اور باغی پر نازل ہوا کرتا ہے۔ والسلام‘‘۔

ساتھ ہی ایک خط عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے نام بھی تحریر کیا۔ ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - اللہ کے بندے علی امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی طرف سے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نام: اما بعد: دنیا اپنی طرف متوجہ کر کے باقی ہر شے سے غافل کر دیتی ہے اور دنیا کی طلب میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ جوں جوں اسے دنیا سے کچھ حاصل ہوتا ہے توں توں اس کی ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے لہٰذا جو کچھ حاصل ہو چکا ہوتا ہے وہ اُس سے جو حاصل نہیں ہوا ہوتا بے نیاز نہیں کرتا۔ حالانکہ ذرا آگے چل کے ہر ذخیرے اور اندوختے سے جدائی ہی جدائی ہے۔ سعادت مند وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔ لہٰذا معاویہ کے ساتھ اس کے باطل میں معاونت کر کے اپنے عمل اپنے عمل کو تباہ و برباد مت کرو۔ معاویہ نے حق پس پشت ڈال دیا ہے اور باطل کو گلے لگا لیا ہے۔ والسلام‘‘۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ’’عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام: اما بعد: جس شے میں ہم سب کی بہتری اور رفع افتراق پوشیدہ ہے یہ ہے کہ، آپ ہمارا مطالبہ مان لیں، یہ کہ ہم حق پر ہیں یا آپ اس امر کا فیصلہ شوریٰ کرے۔ لوگ ہمیں اس معاملے میں از روئے صداقت بری الذمہ قرار دے دیں گے۔ والسلام‘‘۔

کہتے ہیں کہ جب علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام کی طرف کوچ کرنے کا تہیہ کیا تو اس اثنا میں یوم جمعہ آ گیا۔ آپ نے منبر پر چڑھ کے حمد و ثنائے الٰہی بیان کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھا پھر ارشاد کیا ’’اے لوگو! کوچ کرو دشمنانِ سنن اور دشمنانِ قرآن کی جانب۔ کوچ کرو قاتلینِ مہاجرین و انصار کی طرف۔ کوچ کرو ان جفا پیشہ بزدلوں کی طرف جنہوں نے ڈاکے مارے اور بادل نخواستہ اسلام قبول کیا تھا۔ کوچ کرو ان لوگوں کی طرف جن کو غنیمت میں تالیفِ قلب کے لیے حصہ ملتا تھا۔ کوچ کرو تا کہ لوگوں کو ان کے خوف سے بچا لو‘‘۔

اس وقت بنو فزارہ کا ایک فرد اَرْبَد نامی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا: ’’کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ہمراہ جا کر اسی طرح اپنے شامی بھائیوں کو ہلاک کر دیں جس طرح آپ کی معیت میں جا کے اپنے بصری بھائیوں کو ہلاک کیا تھا۔ اللہ کی قسم ہرگز ہرگز نہیں۔ اب ہم سے یہ نہ ہوگا‘‘۔

یہ سن کر اشتر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: ’’اے لوگو! تم میں سے کون اس کا سر لے گا‘‘۔

فزاری یہ سن کر بھاگ اٹھا اور ایک جتھا اس کا تعاقب کرنے لگا آخر کُناسہ کے مقام پر اس کو جالیا، اور اتنے جوتے مارے کہ وہ گر پڑا۔ پھر اسے روندنا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ چل بسا۔ جب علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو کہا مقتول جس کا قاتل نامعلوم ہے۔ جانے اسے کس نے مارا“۔ چنانچہ بیت المال سے اس کے وارثوں کو دیت ادا کر دی۔ بنو تمیم کے ایک شاعر کا قول ہے۔

(۱) میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میری موت ایسی نہ ہو جیسے سوقِ براذین میں اربد کی ہوئی تھی۔

(۲) بنو ہمدان نے اس پے درپے جوتے برسائے ایک ہاتھ اٹھتا تھا تو دوسرا تڑ سے پڑتا تھا۔

اس موقع پر اشتر نے اٹھ کر کہا: ”اے امیر المومنین آپ نے اس غدار کی زبان سے جو کچھ سنا اس کی بنا پر ہمارے تعاون اور ہماری امداد کے معاملے میں بددل نہ ہوں۔ یہ سب لوگ جو آپ کو نظر آرہے ہیں آپ کے حامی ہیں۔ یہ اپنی جانوں کو آپ سے عزیز نہیں جانتے اور آپ کے بعد زندہ رہنے کے ہرگز خواہاں نہیں لہٰذا آپ ہمیں لے کر اپنے دشمنوں کی سمت کوچ بول دیجیے۔ اللہ کی قسم موت سے ڈرنے والا موت سے بچ نہیں سکتا۔ کسی بھی طالبِ بقا کو بقا حاصل نہ ہوگی۔ جو اس امید کے سہارے جیتا ہے فریب خوردہ ہے“۔ یہ سن کر سبھی اصحاب نے کوچ کرنے پر اظہار رضامندی کر دیا ماسوا عبداللہ بن مسعود، عبیدہ سلمانی اور ربیع بن خُثیم اور ان کے ساتھیوں کے جن کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ یہ سب لوگ قاری تھے۔ انہوں نے عرض کیا: ”امیر المومنین باوصف اس کے ہم آپ کی فضیلت کے قائل ہیں ہمارے نزدیک اس کا جنگ کا معاملہ مشکوک ہے۔ آخر آپ کو اور دیگر مسلمانوں کو ان لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو مشرکین کے خلاف نبرد آزما ہوں لہٰذا آپ ہمیں مشرکین کی کسی سرحد پر متعین کر دیں کہ ہم وہاں کے ساکنوں کے خلاف صف آراء ہوں۔ علی رضی اللہ عنہ نے انہیں قزوین ورے کی سرحد پر متعین کر کے ربیع بن خثیم کو ان کا امیر مقرر کیا اور ایک جھنڈا ان کے سپرد کر دیا۔ یہ پہلا جھنڈا ہے جو کوفے میں کسی کے سپرد کیا گیا۔

اسی اثناء میں علی رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور عمرو بن حمق رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ کو برملا گالیاں دیتے ہیں اور شامیوں پر لعنت بھیجتے ہیں لہٰذا ان کی طرف آدمی بھیج کر ہدایت کی جو کچھ مجھ تک پہنچا ہے اس سے باز رہو“۔

اس پر وہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: ”اے امیر المومنین کیا ہم حق پر نہیں اور کیا وہ لوگ باطل پر نہیں؟“۔

جواب دیا: ”بالکل بجا، کعبۂ غلاف پوش کے اللہ کی قسم“۔

بولے: ’’تو پھر انہیں گالیاں دینے اور ان پر لعنت بھیجنے سے آپ ہمیں منع کیوں کرتے ہیں۔ [1]

علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’میں پسند نہیں کرتا کہ تم لوگ دشنام طراز اور لعنت گو بنو۔ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ اے اللہ! نہ ہمارا خون بہے اور نہ ہمارے دشمنوں کا۔ اے اللہ! ہماری باہمی چپلقش کو دور کر دے۔ اے اللہ اُن لوگوں کو گمراہی سے بچا کے راہِ ہدایت دکھا تا کہ حق کو جہل سے ممیز کیا جا سکے اور حق اس گمراہی کی لہروں سے ابھر کر سامنے آ سکے جس میں وہ غرق ہو رہا ہے‘‘۔

کہتے ہیں کہ کوچ کے وقت علی رضی اللہ عنہ نے بذریعہ منادی حکم دیا کہ لوگ نکل کر نُخیلہ کی لشکر گاہ میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ لوگ تیار ہو کر نکلنے لگے علی رضی اللہ عنہ نے کوفے میں اپنا قائم مقام ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا۔ یہ ان ستر بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر شبِ عقبہ کو بیعت کی تھی۔ بہر حال علی رضی اللہ عنہ نے نخیلہ کی جانب باگ اٹھائی۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان کے آگے آگے تھے اور جا کے نخیلہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔

وہاں سے جملہ عمال کے نام احکام روانہ کیے کہ ان کے پاس حاضر ہو جائیں۔ جب یہ خط ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے لوگوں کو بلوایا اور خطاب کیا۔ سب سے پہلے جنہوں نے صدائے رضا بلند کی وہ احنف بن قیس رضی اللہ عنہ تھے، پھر خالد بن معمر سدوسی، پھر عمرو بن مرحوم عبدی۔ اس کے بعد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود الدولی کو بصرہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور اپنی جمعیت کو لے کر نخیلہ کے مقام پر علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔

جب علی رضی اللہ عنہ کے دور افتادہ چار سُو بکھرے ہوئے ساتھی ان کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے نخیلہ سے عزم رحلت کیا اور پھر زیاد بن نصر اور شریح بن ہانی کو بلا کر چھ چھ ہزار سواروں کی قیادت سپرد کر دی اور ہدایت کی تم دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ کوچ کرو۔ اگر کوئی جھڑپ دونوں کو جمع کر دے تو پھر اے زیاد دونوں لشکروں کے کماندار تم ہو گے۔

ہم نے اپنی تحریر کا آغاز شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی تحریر سے کیا ہے اور اختتام بھی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی تحریر سے کر رہے ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اہل شام نے کس طرح سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں ملوث کر کے ان پر یہ تہمت عائد کی گئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی جانب مائل تھے اور انہوں نے قاتلین عثمان کی پشت پناہی کی۔

لَمْ يَكُنْ عَلِيٌّ مَعَ تَفَرُّقِ النَّاسِ عَلَيْهِ مُتَمَكِّنًا مِنْ قَتْلِ قَتَلَةِ عُثْمَانَ إِلَّا بِفِتْنَةٍ تَزِيدُ الْأَمْرَ شَرًّا

وَبَلَاءً، وَدَفْعُ أَفْسَدِ الْفَاسِدَيْنِ بِالْتِزَامِ أَدْنَاهُمَا أَوْلَى مِنَ الْعَكْسِ؛ لِأَنَّهُمْ كَانُوا عَسْكَرًا، وَكَانَ لَهُمْ قَبَائِلُ تَغْضَبُ لَهُمْ، وَالْمُبَاشِرُ مِنْهُمْ لِلْقَتْلِ ن، م: الْقَتْلِ.- وَإِنْ كَانَ قَلِيلًا - فَكَانَ رِدْؤُهُمْ أَهْلَ الشَّوْكَةِ، وَلَوْلَا ذَلِكَ لَمْ يَتَمَكَّنُوا. وَلَمَّا سَارَ طَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ إِلَى الْبَصْرَةِ لِيَقْتُلُوا قَتَلَةَ عُثْمَانَ، قَامَ بِسَبَبِ ذَلِكَ حَرْبٌ قُتِلَ فِيهَا. خَلْقٌ. وَمِمَّا يُبَيِّنُ ذَلِكَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ قَدْ أَجْمَعَ . النَّاسُ عَلَيْهِ بَعْدَ مَوْتِ عَلِيٍّ، وَصَارَ أَمِيرًا عَلَى جَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ، وَمَعَ هَذَا فَلَمْ . يَقْتُلْ قَتَلَةَ عُثْمَانَ الَّذِينَ كَانُوا قَدْ بَقُوْا. بَلْ رُوِيَ عَنْهُ أَنَّهُ [لَمَّا] . قَدِمَ الْمَدِينَةَ . حَاجًّا فَسَمِعَ الصَّوْتَ فِي دَارِ . عُثْمَانَ : " يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَاهُ، يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَاهُ ". ، فَقَالَ : مَا هَذَا؟ قَالُوا: بِنْتُ عُثْمَانَ تَنْدُبُ عُثْمَانَ. فَصَرَفَ . النَّاسَ، ثُمَّ ذَهَبَ إِلَيْهَا فَقَالَ: يَا ابْنَةَ عَمِّ إِنَّ النَّاسَ قَدْ بَذَلُوا لَنَا الطَّاعَةَ عَلَى كُرْهٍ، وَبَذَلْنَا لَهُمْ حِلْمًا عَلَى غَيْظٍ، فَإِنْ رَدَدْنَا حِلْمَنَا رَدُّوا طَاعَتَهُمْ؛ وَلَأَنْ تَكُونِي بِنْتَ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَكُونِي وَاحِدَةً مِنْ عُرْضِ النَّاسِ، فَلَا أَسْمَعَنَّكِ بَعْدَ الْيَوْمِ ذَكَرْتِ عُثْمَانَ . فَمُعَاوِيَةُ - رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ -، الَّذِي يَقُولُ الْمُنْتَصِرُ لَهُ: إِنَّهُ كَانَ مُصِيبًا فِي قِتَالِ عَلِيٍّ، لِأَنَّهُ كَانَ طَالِبًا لِقَتْلِ . قَتَلَةَ عُثْمَانَ، لَمَّا . تَمَكَّنَ وَأَجْمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ لَمْ يَقْتُلْ قَتَلَةَ عُثْمَانَ. فَإِنْ كَانَ قَتْلُهُمْ وَاجِبًا، وَهُوَ مَقْدُورٌ لَهُ، كَانَ فِعْلُهُ بِدُونِ قِتَالِ الْمُسْلِمِينَ أَوْلَى مِنْ أَنْ يُقَاتِلَ عَلِيًّا وَأَصْحَابَهُ لِأَجْلِ ذَلِكَ، وَلَوْ قَتَلَ مُعَاوِيَةُ قَتَلَةَ عُثْمَانَ لَمْ يَقَعْ مِنَ الْفِتْنَةِ أَكْثَرَ مِمَّا وَقَعَ لَيَالِيَ صِفِّينَ. وَإِنْ كَانَ مُعَاوِيَةُ مَعْذُورًا فِي كَوْنِهِ لَمْ يَقْتُلْ قَتَلَةَ عُثْمَانَ إِمَّا . لِعَجْزِهِ عَنْ ذَلِكَ، أَوْ لِمَا يُفْضِي إِلَيْهِ ذَلِكَ مِنَ الْفِتْنَةِ وَتَفْرِيقِ . الْكَلِمَةِ وَضَعْفِ سُلْطَانِهِ، فَعَلِيٌّ أَوْلَى أَنْ يَكُونَ مَعْذُورًا [أَكْثَرَ] . مِنْ مُعَاوِيَةَ، إِذْ كَانَتِ الْفِتْنَةُ وَتَفْرِيقُ الْكَلِمَةِ وَضَعْفُ سُلْطَانِهِ بِقَتْلِ الْقَتَلَةِ لَوْ سَعَى فِي ذَلِكَ أَشَدَّ. وَمَنْ قَالَ: إِنَّ قَتْلَ الْخَلْقِ الْكَثِيرِ الَّذِينَ قُتِلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ عَلِيٍّ كَانَ صَوَابًا مِنْهُ لِأَجْلِ قَتْلِ قَتَلَةِ عُثْمَانَ، فَقَتْلُ مَا هُوَ دُونَ ذَلِكَ لِأَجْلِ قَتْلِ قَتَلَةِ عُثْمَانَ أَوْلَى أَنْ يَكُونَ صَوَابًا، وَهُوَ لَمْ يَفْعَلْ ذَلِكَ لَمَّا تَوَلَّى . ، وَلَمْ يَقْتُلْ قَتَلَةَ عُثْمَانَ . وَذَلِكَ أَنَّ الْفِتَنَ إِنَّمَا يُعْرَفُ مَا فِيهَا مِنَ الشَّرِّ إِذَا أَدْبَرَتْ.⑪

سیدنا علی رضی اللہ عنہ مصلحت کے تحت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص میں تاخیر کے قائل تھے لیکن اس مصلحت کو نہیں

مانا گیا اور قتال کی نوبت آ گئی حتی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مصلحت کی پیروی کی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے معاملے میں چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ منہاج السنہ میں لکھتے ہیں:

''حقیقت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اتنی قوت حاصل نہ ہو سکی تھی کہ آپ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرتے۔ اگر ایسے ہوتا بھی تو اس سے مزید فتنہ و فساد اور بہت بڑا شر پھیل جاتا۔ جبکہ بڑے فساد سے بچنے کے لیے چھوٹے فساد کو قبول کر لینا یہ مصلحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پورا لشکر تھے۔ ان کے پیچھے ان کے قبائل تھے جو ان کا دفاع کر رہے تھے اور جو لوگ براہ راست قتل میں شریک ہوئے تھے؛ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے قبائل کے سرکردہ لوگ تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آپ کے قتل کرنے پر قادر نہ ہو سکتے تھے۔ جب سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان کو قتل کرنے کے لیے بصرہ کی طرف چل پڑے تو اس وجہ سے جنگ بپا ہوئی جس میں بہت ساری خلقت قتل ہوئی۔ جس چیز سے یہ معاملہ مزید واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد لوگ معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے؛ اور آپ مسلمانوں کے امیر عام بن گئے تھے؛ مگر اس کے باوجود آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے، انہیں قتل نہ کر سکے۔ بلکہ یہ روایت کیا گیا ہے کہ: ''جب معاویہ رضی اللہ عنہ سفر حج کے لیے مدینہ پہنچے تو آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے آوازیں سنیں: ہائے امیر المومنین! ہائے امیر المومنین!''۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے: لوگوں نے کہا: یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہے جو ان کے خون کا مطالبہ کر رہی ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو اسی حال میں چھوڑا؛ اور خود اس کی طرف چلے گئے؛ اور یوں گویا ہوئے:

''اے میری چچازاد! لوگوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری اطاعت کی ہے۔ اور ہم غصہ کے باوجود ان کیساتھ بردباری اور تحمل مزاجی کا سلوک کر رہے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ بردباری نہ کریں تو وہ ہماری اطاعت ترک کر دیں گے۔ اور یہ کہ تم امیر المومنین کی بیٹی کی حیثیت سے عزت و اکرام کے ساتھ بیٹھو، اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل بن جاؤ''۔ آج کے بعد میں نہ سنوں کہ تم نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو یاد کیا ہے''۔

معاویہ رضی اللہ عنہ جو کہ آپ کے قصاص کے طلب گار تھے؛ جو کہتے تھے کہ:

''آپ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال میں حق پر ہیں؛ اس لیے کہ آپ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو قتل کرنا چاہتے تھے؛ مگر جب آپ کو قدرت و اختیار حاصل ہو گیا؛ اور لوگ آپ کے ہاتھ پر جمع ہو گئے؛ تو آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو قتل نہیں کیا؛ اگرچہ انہیں قتل کرنا واجب بھی تھا؛ اور آپ کو قدرت و اختیار بھی حاصل تھا؛ تو مسلمانوں سے جنگ

کیے بغیر یہ کام کر گزرنا سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں سے جنگ کرنے کی نسبت زیادہ اولی و اسہل[11] تھا۔ اور اگر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل بھی کر دیتے تو اتنا بڑا فساد پیدا نہ ہوتا جتنا صفین کی راتوں میں ہوا تھا۔ اگر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے میں معذور تھے؛ خواہ وہ اپنے عجز و کمزوری کی وجہ سے یا پھر فتنہ برپا ہونے کے اندیشہ سے؛ کیونکہ اس سے پھر جماعت بندی شیرازہ بکھر جاتا [اور لوگ بغاوت کر جاتے] اور آپ کی حکومت کمزور ہو جاتی۔ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ عذر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عذر سے زیادہ مقبول ہے۔ اس لیے کہ فتنہ گروں اور فسادیوں کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سے مزید فتنہ پیدا ہوتا؛ اختلاف پیدا ہوتا؛ حکومت کمزور ہو جاتی؛ خواہ اس بارے میں جتنی بھی سخت کوششیں کی جائیں۔

مضمون کی تیاری کے مصادر:

الكتاب: الأخبار الطوال المؤلف: أبو حنيفة، أحمد بن داود الدينوري (ت ٢٨٢ هـ) تحقيق: عبد المنعم عامرمراجعة: الدكتور جمال الدين الشيال [ت ١٣٨٧ هـ] الناشر: وزارة الثقافة والإرشاد القومي - مصر الطبعة: الأولى، ١٩٦٠ م (طبع: دار إحياء الكتب العربية - عيسى البابي الحلبي وشركاه)

[الكتاب : سلسلة مصابيح الهدى ص ١١المؤلف : محمد بن إبراهيم بن إبراهيم بن حسان مصدر الكتاب : دروس صوتية قام بتفريغها موقع الشبكة الإسلامية]

[انساب الاشراف للبلاذری : ٢٧٥/٢](كتاب منهاج السنة النبوية - [ابن تيمية] - 4/ 407 - 409)

(منهاج السنة ـ للشيخ الإسلام إمام ابن تيمية رحمه الله ـ ٤/١٤١) . (قال الشيخ عثمان الخميس فى كتابه ـ حقبة من التاريخ ما بين وفاة النبي صلي الله عليه وسلم إلى مقتل الحسين رضي الله عنه ٦١ هـ ـ للشيخ عثمان الخميس ـ (ص : ١٨٨-١٨٩) .

الكتاب: صحيح وضعيف ⑪ تاريخ الطبري، للإمام أبي جعفر بن جرير الطبري (٢٢٤ - ٣١٠ هـ) ⑫ حققه وخرج رواياته وعلق عليه: محمد بن طاهر البرزنجي إشراف ومراجعة:

محمد صبحي حسن حلاق [ت ١٤٣٨ هـ]الناشر: دار ابن كثير، دمشق - بيروت الطبعة: الأولى، ١٤٢٨ هـ - ٢٠٠٧ م(①④⑦/⑧)

[البداية والنهاية (⑦/②⑤⑧) المؤلف : أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (ت ٧٧٤ هـ) الناشر: مطبعة السعادة - القاهرة دار الفكر - بيروت]

ابومصعب اثری کی تعلیق ختم ہوگئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان فتنوں سے الگ رہے

پھر چونکہ جنگ جمل اور جنگ صفین کا تعلق ہنگامی اور مقامی صورت حال سے تھا، اس لئے پورا عالم اسلام اس سے الگ رہا، اور شامی اور مصری فوجیں نبرد آزما ہوئیں، یہ نہ کوئی کفار کے خلاف جہاد تھا، اور نہ فتنہ ارتداد کے خلاف اقدام تھا، بلکہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی تھی، اس لیے تمام بلادِ اسلامیہ عموماً اس سے الگ ہی رہے، اور طرفداران بنوامیّہ اور شیعان اہل بیت لڑے بھڑے اسی لیے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے موافق ہونے کے باوجود اپنے کو فتنہ سے دور رکھا، اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ تو کیا دیتے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ بھی نہ دے سکے، اگر وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرفدار بن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے ہوتے تو حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی طرح وہ بھی جنگ جمل اور جنگ صفین میں کہیں نظر آتے، بلکہ دو چار صحابہ رضی اللہ عنہم جو شریک بھی ہوئے تھے، ان میں سے بعض میدان سے واپس چلے آئے تھے، جیسا کہ جنگ جمل میں علی رضی اللہ عنہ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی، جو ان دونوں حضرات کے بارے میں پیشین گوئی تھی، سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو سنتے ہی۔۔۔

[واقبل الزبير حتى دنا من ابنه عبد الله وبيده الراية العظمى، فقال: يا بنى، انا منصرف، قال: وكيف يا أبت؟، قال: ما لي في هذا الأمر من بصيره، وقد اذكرني على امرا، قد كنت غفلت عنه، فانصرف يا بنى معى، فقال عبد الله: والله لا ارجع او يحكم الله بيننا. فتركه الزبير، ومضى نحو البصره ليتحمل منها، ويمضى نحو الحجاز. ويقال: ان طلحه لما علم بانصراف الزبير هم ان ينصرف، فعلم مروان بن الحكم ما يريده،

فرماه بسهم، فوقع في ركبته، فنزف حتى مات]

لشکر سے نکل کر اپنے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بیٹا میں تو چلا، مجھے علی رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث یاد دلا دی ہے۔ جس سے میں غافل تھا۔ اس کے بعد جب زبیر رضی اللہ عنہ باہر نکلے تو سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کو سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کی واپس ہونے کا علم ہوا تو سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ بھی واپس کے لیے باہر نکلے تو مروان بن حکم نے آپ کو ایسا تیر مارا کہ آپ وہیں شہید ہو گئے (الاخبار الطوال ص:۱۴۸)

اس حقیقت کو بے غبار معلوم کرنے کے لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ تصریح کافی ہے:

[جمهور الصحابة وساداتهم تاخروا عن الفتنة ، قال ابو ایوب السختیانی عن ابن سیرین ، قال هاجت الفتنة واصحاب رسول الله ﷺ عشره الاف فوقف ما شهد وانه بل لم یبلغوا ثلاثین فهذا یقوله محمد بن سیرین مع ورعه الباهر فی منطقة وقال منصور بن عبد الرحمٰن قال الشعبی لم یشهد الجمل من اصحاب النبی ﷺ غیر علی و عمار و طلحة والزبیر ، فان جاؤا بخامس فانا کذاب ، کانه عنی من المهاجرین السابقین۔ وقال عبد الله بن احمد حدثنا ابی حدثنا امیة بن خالد قال قیل لشعبة ان ابا شیبة روی عن الحکم عن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ قال شهد صفین من اهل بدر سبعون رجلا ، قال شعبة کذب والله ، ذاکرنا الحکم ، ما وجدنا شهد صفین من اهل بدر غیر خزیمة بن ثابت ، قلت هذا النفی یدل علی قلة من حضرها] (المنتقیٰ ص :۳۸۹)

”جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بڑے حضرات فتنہ سے بچے رہے، ابوایوب سختیانی نے ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ جس وقت فتنہ برپا ہوا، دنیا میں دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود تھے، مگر ان میں سے دس حضرات بھی فتنہ میں نہ شریک ہوئے، بلکہ شریک ہونے والوں کی تعداد تیس تک بھی نہ پہونچی، یہ محمد بن سیرین کا بیان ہے جو بات کہنے میں مشہور محتاط ہیں، اور منصور بن عبد الرحمن کا بیان ہے کہ امام شعبی نے کہا ہے کہ جنگ جمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے سوائے علی، عمار، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم کے اور کوئی شریک نہیں ہوا، اگر یہ لوگ ان چار کے علاوہ کسی پانچویں کو پیش کریں تو میں جھوٹا ہوں، اور امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد امام احمد نے امیہ بن خالد سے روایت کی کہ امام شعبہ سے کہا گیا کہ ابوشیبہ نے حکم سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کی

ہے کہ جنگ صفین میں ستر بدری صحابہ رضی اللہ عنہم شریک ہوئے تو شعبہ نے کہا یہ جھوٹ ہے، اللہ کی قسم ہم نے خود حکم سے اس بارے میں گفتگو کی، تو اہل بدر میں سے خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں پایا میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں کہ یہ نفی اس بات کو بتاتی ہے کہ فتنہ میں صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے بہت کم لوگ شریک ہوئے''۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس تصریح کے بعد ان تمام مکائد کا پردہ چاک ہو جاتا ہے جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر دمِ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کر رہے تھے، اور انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت پر بلیغ تبصرہ

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے بارے میں ایک نہایت ہی بلیغ اور جامع تبصرہ فرمایا ہے، اور دو لفظ میں اپنے دورِ خلافت کی پوری حقیقت واضح کر دی ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت کے بارے میں یہ اظہار خیال ہر موافق و مخالف کے غور و فکر کے لیے مینارہ نور ہے، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

[سال رجل علياً رضى الله تعالىٰ عنه ما بال المسلمين اختلفوا عليك ، ولم يختلفوا علىٰ ابى بكر و عمر ، فقال لان ابا بكر و عمر كان واليين علىٰ مثلى ، وانا اليوم وال علىٰ مثلك] (مقدمه ابن خلدون ص : ١٧٦)

''ایک شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے آپ کے بارے میں اختلاف کیا، اور حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اختلاف نہیں کیا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بات یہ ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما مجھ جیسے کے والی و خلیفہ تھے اور میں آج تم جیسے کا والی ہوں''۔

ایک دیانتدار مورخ و ناقد اور منصف مزاج مؤلف و محقق کے لیے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ ان کے پورے دورِ خلافت کی حقیقی تصویر ہے اور ان کے اس جواب کے بعد ان کے دورِ خلافت کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہو سکتی اسی لیے تو علمِ تاریخ کے مجدد و ناقد علامہ ابنِ خلدون نے یہ جملہ نقل کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ہر طرح کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیا ہے۔

ان محاربات میں اقرب الی الحق کون لوگ تھے؟

سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین جو محاربات ہوئے ہیں ان میں کون حق سے قریب تھا، اور کون حق سے دور تھا، اسے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

[واما محاربته فلامور لا تخرجه عن الاسلام ، وان كان على اقرب الى الحق ، والىٰ به منه] (المنتقىٰ ص : ۲۶)

”معاویہ رضی اللہ عنہ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنا ایسی باتوں کی بنا پر تھا، جو ان کو اسلام سے ے خارج نہیں کرتی ہیں، اگرچہ علی رضی اللہ عنہ اقرب الی الحق تھے، اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اس کے زیادہ مستحق تھے“۔

اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اقرب الی الحق کی دلیل میں بخاری و مسلم کی احادیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات کو پیش کیا ہے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتنہ کے ایام میں گھر میں بیٹھ رہنے کی تاکید فرمائی ہے، اور جن کے راوی نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑے، نہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑے۔

[كسعد بن ابى وقاص ، و محمد بن مسلمة واسامة لم يقاتلوا لا مع على ، ولا مع معاوية ثم الذين مع على اخف جرماً من الذين قتلوا عثمان صبرا] (المنتقىٰ ص :۲۶)

”جیسے سعد بن ابی وقاص اور محمد بن مسلمہ اور اسامہ رضی اللہ عنہم، جنہوں نے نہ تو علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ کر قتال کیا اور نہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ کر قتال کیا پھر جن لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ کر قتال کیا ان کا جرم ان لوگوں سے ہلکا ہے جنہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو گھیر کر قتل کیا“۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کی حیثیت اور ان کے مقام وموقف کی توضیح کرتے ہوئے دونوں کے طرفداروں کی حرکتوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

[واكثر الذين كانوا يختارون القتال من الطائفتين لم يكونوا يطيعون علياً ولا معاوية وكان على و معاوية رضى الله عنهما اطلب لكف الدماء من اكثر المقتتلين لكن غلبا فيما وقع] (ص : ۲۶۳)

”دونوں گروہوں میں سے اکثر لوگ جو جنگ کرنا چاہتے تھے وہ نہ علی ؓ کی اطاعت کرتے تھے نہ معاویہ ؓ ہی کی۔ اور علی ؓ اور معاویہ ؓ خون خرابہ نہ ہونے کے خواہاں ان لوگوں سے زیادہ تھے جو وہاں طلب جنگ کر رہے تھے لیکن جو واقع ہوا اس میں وہ دونوں حضرات مغلوب ہو گئے“۔

مؤلف نے صرف علی ؓ کو سبائیوں کے ہاتھوں مجبور و معذور بنانے پر سارا زور خرچ کیا ہے، اور ان کو بے دست و پا بنا کر سبائیوں کے ہاتھ دے دینے کی ترکیب نکالی ہے، مگر امام ابن تیمیہ ؒ سیدنا علی ؓ کو حق سے قریب تر اور ان کے آدمیوں کو قاتلین عثمان ؓ کے مقابلے میں کم گناہ گار بناتے ہیں اور سیدنا علی اور معاویہ ؓ دونوں کے آدمیوں کو نافرمان، خود غرض، اور من مانی کاروائی کرنے والے کے ساتھ دونوں کو نافرمان ثابت کرتے ہیں، اور سیدنا علی ؓ کی طرح معاویہ ؓ کو بھی جنگ بازوں سے مغلوب ثابت کرتے ہیں، معاویہ ؓ کا شامیوں کے ہاتھوں مجبور ہو جانے کا واقعہ ابھی ابھی آپ نے پڑھا ہے، اس کی روشنی میں امام ابن تیمیہ ؒ کے اس قول کو دیکھئے تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔

سیدنا علی ؓ اور امام احمد بن حنبل ؒ

سید الفقہاء والمحدثین، امام احمد بن حنبل ؒ نے سیدنا علی ؓ کی خلافت و امامت کے بارے میں جو حقیقت بیان کی ہے، اسے ہم امام ابن جوزی ؒ کی کتاب ”مناقب الامام احمد بن حنبل“ سے پیش کرتے ہیں محترم قارئین اس تصریح کو اس حیثیت سے دیکھیں کہ یہ امام المحدثین امام احمد کا مسلک ہے، اور ان کے مقابلہ میں مؤلف کتاب ”خلافتِ معاویہ ؓ و یزید“ نے جو کوشش کی ہے وہ ان کی یا ان جیسے لوگوں کی ذاتی رائے ہے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ خلفائے اربعہ کی خلافت کا ذکر کر رہے تھے، انہوں نے سیدنا علی ؓ کے بارے میں گفتگو طویل کی تو امام احمد بن حنبل ؒ نے فرمایا:

[یا هؤلاء وقد اكثرتن القول علی و خلافته ان الخلافة لم تزين علياً بل علی زينها] (مناقب الامام احمد ص : ۱۶۳)

”اے لوگو! تم نے علی ؓ اور خلافتِ علی ؓ کے بارے میں گفتگو طویل کی، خلافت نے علی ؓ کو زینت نہیں بخشی، بلکہ علی ؓ نے خلافت کو زینت بخشی ہے“۔

آپ کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ والد محترم نے حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کو بیان فرمایا میں نے عرض کیا، اے والد تفضیل صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، تو آپ نے فرمایا خلافت میں ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم ہیں یہ سن کر میں نے عرض کیا اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تو فرمایا:

[یا بنی علی بن ابی طالب من اهل بیت لا یقاس بهم احد] (ص :١٦٣)

”اے بیٹے! سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو ایسے خاندان سے ہیں کہ اس پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا“۔

صاحبزادہ عبداللہ کا بیان ہے کہ:

[سمعت ابی یقول ما لاحد من الصحابة من الفضائل بالاسانید الصحاح مثل لعلی رضی الله عنه] (ص :١٦٣)

”میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے جتنے فضائل صحیح سندوں کے ساتھ احادیث میں وارد ہوئے ہیں اتنے کسی دوسرے صحابی کے نہیں“۔

ابوسعید ہشام بن منصور بخاری کا بیان ہے میں نے امام احمد بن حنبل کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

[من لم یثبت الامامة لعلی فهو اضل مین حمار اهله] (ص :١٦٣)

”جو آدمی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت نہ تسلیم کرے تو وہ اپنے گھر والوں کے گدھے سے بھی احمق ہے“۔

حنبل نامی ایک راوی کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل سے سوال کیا کہ کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

[سبحان الله یقیم علی الحدود ، ویقطع ، ویاخذ الصدقة ویقسمها بلا حق وجب له؟ اعوذ بالله من هذه المقالة نعم خلیفة رضیه اصحاب رسول الله ﷺ وصلوا خلفه و غزوا معه و جاهدوا وهجوا وکانوا یسمونه امیر المومنین ، راضین بذالك غیر منکرین فنحن تبع لهم] (مناقب الامام ص : ١٦٤)

”سبحان اللہ! کیا بلا حق کے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا وہ حدود قائم کرتے تھے ہاتھ کاٹتے تھے، اور زکوۃ وصدقات

وصول کر کے اسے تقسیم کیا کرتے تھے؟ میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، ہاں اس لئے علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے راضی تھے، انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، ان کے ساتھ غزوہ، جہاد کیا اور حج کیا، اور وہ ان کو امیر المومنین کہتے تھے، ان کی امارت وخلافت سے راضی تھے، منکر نہیں تھے، اس لیے ہم تو ان ہی صحابہ رضی اللہ عنہم کے تابع ہیں''۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ایمان افروز باتوں کو غور سے پڑھیے، اور آپ بھی بتائیے کہ آپ امام احمد رحمہ اللہ کی طرح ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمنوا ہیں جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق تسلیم کر کے ان کا پورا پورا ساتھ دیا، یا ان لوگوں میں سے ہیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کرتے ہیں اور ان کو گدھوں کی سی بھی عقل نہیں ہے، یہاں پر حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ اس ضمن میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ امام صاحب نے اسی حدیث کو بیان فرمایا اور اسی کی روشنی میں خلفائے اربعہ کی خلافت کے برحق ہونے کو ثابت کیا، اس حدیث پر امام صاحب کا مفصل بیان آگے آئے گا۔

اگر ہم اس جگہ محدثین کرام کے بیانات کو درج کریں اور خلافت اور خلفائے اربعہ کے اعتقاد کے بارے میں احادیث کی روشنی میں سلف صالحین کی تصریحات کو پیش کریں تو بات بہت طویل ہو جائے گی، اور اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہوگی۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور قاضی ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ

ان تمام مباحثات کے خلاصہ میں قول فیصل کے طور پر ہم قاضی ابوبکر بن عربی مالکی اندلسی کی کتاب ''العواصم من القواصم'' کی مختصر سی جھلک پیش کرتے ہیں، جن کے بارے میں مؤلف نے صفحہ ۳۰۲، ۳۰۳ پر نہایت توصیفی وتوثیقی حاشیہ لکھا ہے:

(قاضی موصوف نے اپنی اس تالیف میں ان اکاذیب کی پوری قلعی کھولی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موقف ومشاجرات کے بارے میں وضع ہوئے، (حاشیہ ص ۳۰۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جو جو اکاذیب عائد کئے گئے ان کی قلعی کھولتے ہوئے قاضی ابوبکر بن عربی نے وہ باتیں نہایت صاف وصریح بیان کر دی ہیں جن کا مؤلف نے ارتکاب کیا ہے، اگر وہ قاضی ابوبکر بن عربی کو ایسا مانتے ہیں اور ان پر ان کو اعتماد ہے تو کیا پھر قتلِ حسین رضی اللہ عنہ اور یزید وابن زیاد کے بارے میں ان کے جو بیانات ہیں، صرف ان ہی میں یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ

کے بارے میں جوانہوں نے قلعی کھولی ہے، اس میں مؤلف کوان پر اعتماد ہے؟ قارئین کرام کے سامنے ابوبکرؒ بن عربی کی جستہ جستہ عبارتیں پیش کی جاتی ہیں ملاحظہ ہوں:

[اما وجود الحرب بينهم فمعلوم قطعاً و اما كونه بهذا السبب فمعلوم كذلك قطعاً وامّا الصواب فمع عليؓ ، لان الطالب للدم لا يصح ان يحكم وتهمة الطالب القاضى لا توجب عليه ان يخرج عليه بل يطلب الحق عنده ، فان ظهر له قضاء والا سكت وصبر] (العوام من القواصم ص ۱۶۴)

’’جنگِ جمل وصفین کا وجود قطعی طور سے معلوم ہے، اور سبب بھی اسی طرح معلوم ہے مگر حق اور راستی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے، کیونکہ دمِ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے طالب کے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ حاکم بن جائے، اور طالب دم (معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ) کا قاضی (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) کو تہمت لگانا یہ واجب نہیں کرتا کہ وہ طالب قاضی کے خلاف خروج کر بیٹھے، بلکہ اسے چاہئے کہ قاضی کے پاس حق طلب کرے، اگر فیصلہ ظاہر ہو جائے تو خیر، ورنہ خاموش رہے اور صبر کرے‘‘،

پھر دو سطر کے بعد فرماتے ہیں:

[ولئن اتهم على بقتل عثمان فليس فى المدينة احد من اصحاب النبى ﷺ الا وهو متهم] (ص :۱۶۵)

’’اور اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ سے متہم کیا گیا تو کون سی بڑی بات ہے، مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی ایک بھی ایسے صحابی نہ تھے جن کو قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ میں متہم نہ کیا گیا ہو‘‘۔ (ایضاً ص:۱۶۵)

پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے برحق ہونے کے سلسلے میں فرماتے ہیں، کہ یہ حقیقت کھل کر سامنے ہے کہ جب معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان کے لیے بھی ممکن نہیں ہوا کہ قاتل عثمان رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کو بھی اپنے حکم سے قتل کر سکیں‘‘ (ص:۱۶۸)
پھر اسی صفحہ پر صحیح مسلم کی ایک حدیث بیان کی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوارج کے بارے میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے افتراق کے زمانہ میں ایک گروہ ان سے الگ ہو جائے گا، جسے مسلمانوں میں سے وہ گروہ قتل کرے گا جو حق سے زیادہ قریب ہوگا، تقتلهم ادنیٰ الطافتين الى الحق ،اس کے بعد لکھتے ہیں:

[فبين ان كل طائفة منها تتعلق بالحق ولكن طائفة على ادنى اليه] (ص :۱۶۸)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہوں میں سے ہر ایک حق سے [1] تعلق رکھتا ہے مگر علی رضی اللہ عنہ کا گروہ حق سے بہت زیادہ قریب تھا“۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا تھا کہ” تقتله الفئة الباغية“(ص:١٧٠) ان کو معاویہؓ کے گروہ نے قتل کیا، اس کے بعد قاضی ابوبکر بن العربی مالکی اندلسی لکھتے ہیں:

[وقتل عثمان فلم يبق على الارض احق بها من على ، فجاءته على قدر فى وقتها ومحلها ، وبين الله على يديه من الاحكام والعلوم ما شاء الله ان يبين ، وقد قال عمر لولا علیؓ لهلك عمر ، وظهر من فقهه وعلمه فى قتال اهل القبلة ، من استدائهم ومناظرتهم وترك مبادرتهم والتقدم اليهم قبل نصب الحرب معهم ونداۂه انه لا تبدأ بالحرب ولا يتبع مولى ، ولا يجهز علیٰ جريح ، ولا تهاج امراة ولا نغنم لهم مالا ، وامره بقبول شهادتهم ، والصلوٰة خلفهم ، حتیٰ قال اهل العلم لولا ما جرى ما عرفنا قتال اهل البغى] (ص:١٩٤)

”جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل ہوا تو روئے زمین پر خلافت کا مستحق سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی نہیں تھا، چنانچہ خلافت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بروقت اور برمحل آئی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر اسلامی احکام وعلوم میں سے جس قدر چاہا ظاہر فرمادیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہوجاتا اور اہل قبلہ کے ساتھ قتال کرنے کے سلسلے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے علم وفقہ سے یہ حقائق ظاہر ہوئے کہ انہوں نے ان کو خود بلایا ان سے بحث ومباحثہ کیا، اور جب لڑائی ہونے لگی تو اعلان کیا کہ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے کسی زخمی کو اور زخمی کر کے نہ مار ڈالا جائے، نہ کسی عورت کو چھیڑا جائے، نہ ان کا مال غنیمت کے طور پر لیا جائے۔ نیز آپ نے ان کی گواہی قبول کرنے، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ اہل علم نے کہا ہے کہ اگر یہ باتیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے وقوع پذیر نہ ہوئی ہوتیں تو ہم باغیوں سے جنگ کرنے کو نہ سمجھتے“۔

فرمایئے یہ قاضی ابوبکر بن عربی کی تصریحات کیا ثابت کر رہی ہیں جن کی مؤلف تعریف وتوصیف کی ہے، اور خود مؤلف کیا سمجھتے ہیں؟ ان عبارتوں سے یہ باتیں بالکل ظاہر ہیں:

(١) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف معاویہ رضی اللہ عنہ کا اقدام دمِ عثمان رضی اللہ عنہ کے پردے میں غلط تھا۔

(۲) قتلِ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ بالکل بری تھے۔

(۳) ان مشاجرات میں حق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔

(۴) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق و برمحل تھی اور انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ اسلامی تعلیم کے عین مطابق تھا، قاضی ابوبکر بن عربی اور ان کی کتاب پر تفصیلی بحث بعد میں آئے گی۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کا مقام و مؤقف

مؤلف کتاب ’’خلافت معاویہؓ و یزید‘‘ نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو غلط کار اور حق کے خلاف خروج کا اقدام کرنے والا ثابت کرنے سے سلسلے میں لکھا ہے:

(نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور احکام شریعت کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے امیر یزید کے خلاف اقدام خروج کا جواز مطلق نہ تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو ان سے ملے، انہیں طرح طرح سمجھایا، اور اس غلط اقدام سے باز رکھنے کی کوششیں کیں (ص:۶۸)

یزید کا ایک قصیدہ نقل کر کے لکھا ہے:

’’تیسرے شعر کے مضمون سے ثابت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی‘‘۔(ص:۷۵)

اس کے بعد کمال غیر ذمہ داری سے ایک مسیحی مورخ ’’دوزی‘‘* کا یہ اقتباس سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے:

’’یہی کیفیت اخلاف کی (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے جو ان کو ایک طفلانہ جرم کا کشتہ خیال کرتے ہیں، ایرانی شدید تعصب نے اس تصویر میں خدوخال بھرے، اور (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ کو بجائے ایک معمولی قسمت آزما کے جو ایک انوکھی لغزش وخطائے ذہنی اور قریب قریب غیر معقول حبّ وجاہ کے کارن ہلاکت کی جانب تیزی سے رواں دواں ہوں، ولی اللہ کے روپ میں پیش کیا ہے، ان کے ہم عصروں میں اکثر وبیشتر انہیں ایک دوسری نظر سے دیکھتے تھے، وہ انہیں عہد شکنی اور بغاوت کا قصوروار خیال کرتے تھے اس لیے کہ انہوں نے (حضرت) معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید

کی (ولی عہدی) کی بیعت کی تھی، اور اپنے حق یا دعویٰ خلافت کو ثابت نہ کر سکے تھے''۔ (ص:۷۶)

ایک متعصب نصرانی مورخ کا نام لے کر مؤلف نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو ولی اللہ کے روپ میں حب وجاہ اور خطائے ذہنی کا گرفتار بتایا ہے، ان کے معاصرین کو ان کے بارے میں بدگمان ثابت کیا ہے، اور ان کو ایک معمولی قسمت آزما بتانے کی کوشش کی ہے۔

اس کے آگے مؤلف نے کھل کر اپنی بیماری جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف دل میں پیدا ہوگئی ہے، ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تلوار اگر حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ مطہرہ وحبیبہ رسول صلوٰۃ اللہ علیہا کے خلاف بے نیام ہوسکتی ہے اور اس ہودج پر تیر برسائے جاسکتے ہیں، جس میں تمام امت کی ماں تشریف فرما ہو تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف تلوار کیوں نہیں اٹھائی جاسکتی جن کی دعوت محض یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرزند ہونے کی حیثیت سے خلیفہ انہیں بنایا جائے، باوجود اس کے ان کے خلاف شروع سے متشددانہ کاروائی نہیں کی گئی، حالانکہ اصولا یہ مطالبہ ایسا تھا کہ نہ کتاب اللہ سے اس کی کوئی سند پیش کی جاسکتی ہے، نہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، نہ تعامل خلفائے راشدین اور نہ عزائم آل البیت سے، یہی وجہ ہے کہ امت اس نظریہ پر مجتمع نہیں ہوئی، بلکہ کسی درجہ میں بھی اسے قابل اعتناء نہیں سمجھا الخ''۔ (ص:۱۸۰)

ان چند سطروں میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف اس قدر زہر ہے کہ اگر اسے ساری کتاب میں پھیلا دیا جائے تو بھی پورا کا پورا بچ رہے گا، اور کتاب زہریلی ہوجائے گی، جب کہ مؤلف نے پوری کتاب میں یہی کیا ہے۔

ان خرافات، مزعومات، اور بیہودہ خیالات کو ثابت کرنے کے لیے مؤلف نے وہ سب کچھ کیا ہے جو ایک کھلے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

انہوں نے کتابوں کے حوالے غلط دیئے ہیں، عبارتوں میں خیانت کی ہے، مطالب غلط بیان کیے ہیں، ترجمہ غلط کیا ہے، واقعہ کہیں کا ہے، اور اسے کہیں چسپاں کیا ہے، جیسا کہ آئندہ نہایت مدلل ومفصل طور پر معلوم ہوگا۔

اقدام حسین رضی اللہ عنہ کی ضرورت کتاب سنت کی روشنی میں

اسلام میں جہاں تک طرف اتحاد واتفاق اور امن وامان قائم کرنے اور برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے اور اس کے لیے بڑی

سی بڑی جماعتی اور انفرادی قربانی دے کر صبر کی تلقین آئی ہے، وہاں ظلم وستم، فسق وفجور اور منکرات کو مٹانے اور ان کے خلاف خروج کرنے اور صف آراء ہونے کا حکم بھی آیا ہے۔ اسلام کی راہ اعتدال کی راہ ہے، اور حالات کو اعتدال پر رکھنے کے لیے زمانہ اور ماحول کے مطابق دونوں قسم کے احکام صریح طور سے موجود ہیں، اگر ہر جابر و ظالم اور فاسق و فاجر غلبہ وحکمران کے مقابلہ میں صبر وضبط کی روش اختیار کی جائے گی تو دنیا میں ظلم وستم اور فسق وفجور کا بازار گرم ہو جائے گا، اور ارباب عزیمت کے لیے اصلاحِ حال کی کوئی صورت نہ ہوگی، اور اگر حال واستقبال کا جائزہ لیے بغیر ہر ظالم و جابر طاقت سے ٹکر لی جائے گی تو ہوسکتا ہے کہ اصلاح کے بجائے شر وفساد میں اور بحران پیدا ہو جائے، اس لیے مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ جہاں تک امن وامان اور اتحاد واتفاق کا تعلق ہے تم اپنی طرف سے اس کی بحالی کی پوری کوشش کرو، اور اپنی ذات سے امت میں فتنہ نہ ہونے دو، اور جہاں تک ظلم وستم، فسق وفجور اور نواہی ومنکرات کے خلاف نفرت، اقدام اور مقابلہ کا تعلق ہے اس کی روح ضرور باقی رہنی چاہیے، اور کم از کم ایک جماعت اس کے لیے ہونی ہی چاہیے جو ظلم وستم کا مقابلہ کرے، اور حالات کے تقاضے کے مطابق وہ اپنی قوت وعزیمت کو اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرے۔

مؤلف کیاب ''خلافت معاویہؓ ویزید'' نے یزید کی طرف داری میں فتنہ سے بچنے اور پر امن رہنے کے بارے میں احادیث و واقعات تو نقل کر دیے مگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو غلط کار ثابت کرنے کے لیے ان تمام آیات واحادیث اور واقعات کو چھپا دیا جن میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم آیا ہے۔ ظالم حکمران کے مقابلہ میں حق بات کہنے کو افضل جہاد بتایا گیا ہے، اور دین کے اصول وفروع مین تغیّر وتبدل کو مردود قرار دے کر اس کے مٹانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ہم چند آیات واحادیث مثال کے طور پر یہاں درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا خروج یزید کے خلاف ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور احکام شریعت کی رو سے نہ صرف جائز بلکہ واجب تھا، اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت نے یہ اقدام کر کے پوری امت کی طرف سے فرض کی ادائیگی کی، اور اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا ایسا نہ کرتے تو امت شاید اس سے بھی شدید اور عام فتنہ میں مبتلا ہو جاتی، اور بنائے ایک نہ بنتی۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا ''امة داعية الى الخير'' اور ''خیر امت تھے'' جن کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

[وهم اعظم قدراً عند الله واحسن نيتاً من غيرهم] (المنتقیٰ ص:۲۸۶)۔ اور اگر اس ایک نقطہ کو درمیان سے نکال دیا جائے تو شہادت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گی، مؤلف نے اپنی پوری کتاب میں اسی

نقطہ پر سیاہی پھیرنے کی کوشش کی ہے، مگر ہم امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بیان کی روشنی میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بالمقابل ''مردان آخر ہیں اور'' حامیان امن وصلح'' کے اجتہاد کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہوئے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہیوں کو قدر ومنزلت میں اور حسنِ نیت میں بہتر وبرتر مانتے ہیں، اور علامہ ابن خلدون کی رائے کو قول فیصل قرار دیتے ہیں:

[والکل مجتھدون ولا ینکر علیٰ احد من الفریقین فمقاصدھم فی البر وتحری الحق معروفة ، وفقنا اللہ الاقتداء بھم]

''سب کے سب مجتہد ہیں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک پر نکیر نہیں کی جا سکتی کیونکہ نیکی اور تلاش حق کے بارے میں ان کے ارادے مفہوم ومعروف ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی اقتداء کی توفیق بخشے''۔

اب چند آیات واحادیث اور واقعات کو بھی سن لیجئے، اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے بارے میں ان ہی کی روشنی میں فیصلہ کیجئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)(آل عمران : ۱۰۴)

''تم لوگ بہترین امت کو جو لوگوں کے فائدے کے لیے برپا کئے گئے ہو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں، چند احادیث یہاں درج کی جا رہی ہیں، تفصیل کتب احادیث وسیر میں موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

(۱) '' من رای منکم منکرة فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ ، فان لم یستطع فبقلبہ و ذلك اضعف الایمان ''۔ [مسلم]

''تم میں سے جو شخص کوئی امر منکر دیکھے تو چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے اور یہ ایمانی تقاضے کا سب سے کمزور درجہ ہے''۔

(۲) '' افضل الجھاد کلمة عدل عند سلطان جائز '' (ابوداؤد ، ترمذی)

''افضل جہاد جابر حکمراں کے سامنے کلمہ انصاف کہہ دینا ہے''۔

(۳) ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ افضل جہاد کیا ہے، آپ نے فرمایا:

” کلمة حق عند سلطان جائز “۔ (نسائی باسناد صحیح)

’’ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہہ دینا ہے‘‘۔

(۴) ” والذی نفسی بیده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر او لیوشکن الله ان یبعث علیکم عقابا منه ، ثم تدعونه فلا یستجاب لکم “۔ (ترمذی)

’’قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور ضرور کرو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عقاب وعذاب برپا کرے گا، اس کے بعد تم اس سے دعا کرو گے تو تمہاری دعا مستجاب نہ ہوگی‘‘۔

(۵) ” ان الناس اذا راؤا الظالم فلم یاخذوا علیٰ یدیه اوشك ان یعمهم الله بعقاب منه “۔ (ابوداؤد ، ترمذی ، نسائی)

’’جب لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیں تو قریب ہے کہ اللہ ان سب پر اپنا عام عذاب وعقاب برپا کردے گا‘‘۔

(۶) ” انه یستعمل علیکم امراء فتعرفون وتنکرون ، فمن کره فقد برئ ، ومن انکر فقد سلم ، ولکن من رضی وتابع قالوا یا رسول الله الا نقاتلهم؟ قال لا ما اقاموا فیکم الصلوٰة “ (مسلم)

’’خوب سمجھ لو کہ تم لوگوں پر ایسے ایسے امیر وحاکم بنائے جائیں گے جنہیں تم اچھا اور برا سمجھو گے، جو آدمی ان کو ناپسند کرے وہ بری الذمہ ہے، اور جو ان کا انکار کرے گا، سلامت رہے گا، مگر جو ان سے راضی ہو کر ان کا تابع ہوگا، اس پر صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم ایسے امراء وحکام سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے کہا جب تک وہ تم میں رہ کر نماز پڑھیں اس وقت تک جنگ نہ کرنا‘‘۔

(۷) ” عن عبادة بن الصامت قال بایعنا رسول الله علی السمع والطاعة فی العسر ، والیسر ، والنشط والمکره ، وعلیٰ اثرة علینا ، وعلیٰ ان لا ننازع الامر اهله الا ان تروا کفر بواحاً ، عندکم من الله برهان ، وعلیٰ ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی الله

لومة لائم "۔ (بخاری و مسلم)

"عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان باتوں پر بیعت کی، تنگی، کشادگی، خوشی، ناخوشی ہر حال میں سمع وطاعت پر اور مستحق کا حق غیر مستحق کو دے دینے پر صبر کرنے پر اور اس بات پر کہ ہم صاحب امر سے جھگڑا نہ کریں گے مگر اس صورت میں کہ تم لوگ کفر صریح دیکھو، اور تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل بھی ہو اور اس بات پر کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے، اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔

(۸) " من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد "۔ (بخاری مسلم)

"جو شخص ہمارے امر میں ایسی بات ایجاد کر دے جو اس سے نہیں ہے تو اس کا یہ کام مردود ہے"۔

(۹) " من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد "۔ (مسلم)

"جو شخص ایسا کام کرے جس پر ہمارا امر نہیں ہے تو اس کا وہ کام مردود ہے"۔

(۱۰) سیدنا عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ عراق کے والی عبید اللہ بن زیاد کے پاس گئے اور کہا:

" یا بنی انی سمعت رسول الله ﷺ يقول ان شر الرعاء الحطمة، فاياك ان تكون منهم "۔

"اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بدترین حکمران ظالم لوگ ہیں، اس لیے تم اس بات سے بچو کہ ان میں سے ہو۔

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نرم وشیریں بات کو سن کر عبید اللہ بن زیاد نے کہا:

" قال له اجلس فانما انت نخالة اصحاب محمد ﷺ "

"بیٹھ جاؤ تم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں (کھوکھلے) ہو"۔

اس کے اس جملہ کو سن کر سیدنا عائذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" وهل كانت لهم نخالة ، انما كانت نخالة بعدهم وفی غيرهم " (مسلم)

"کیا صحابہ میں نخالہ بھی تھے، نخالہ تو ان کے بعد اور ان کے سوا لوگوں میں تھا"۔

ان احادیث وواقعات کو دیکھئے اور سوچئے کہ اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اوران کے ہمراہی اس وقت ظلم وفسق کے مقابلہ میں کھڑے نہ ہوجاتے تو امت مسلمہ کا انجام کیا ہوتا اور بات کہاں سے کہاں جا پڑتی۔

یزید کے خلاف اقدام کی شدید ضرورت اور حسین رضی اللہ عنہ کا مقام

جب یزید کا فسق وفجور خلافت وامارت پانے کے بعد زیادہ ہوگیا اور وہ علی الاعلان غلط کاریوں میں مبتلا ہوتا رہا، جس کی خبر دور دراز مقامات تک پھیل گئی، تو ایسے وقت میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اس امام جائر اور خلیفہ غلط کار کے مقابلہ میں دین و دیانت کے خالص جذبہ اور حق وصداقت کی پاکیزہ نیت کے ساتھ نکلے، علامہ ابن خلدون مقدمہ میں لکھتے ہیں:

” واما الحسين فانه لما ظهر فسق يزيد عند الكافة من اهل عصره بعثت شيعة اهل البيت بالكوفة للحسين ان ياتيهم فيقوموا بامره فرأى الحسين ، ان الخروج علىٰ يزيد متعين من اجل فسقه لا سيما من له القدرة علىٰ ذلك وظنها من نفسه باهلية و شوكة فاما الاهلية فكانت كما ظن او زيادة واما الشوكة فغلط يرحمه الله فيها “۔

’’سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ جب یزید کا فسق اس کے زمانہ کے تمام لوگوں پر ظاہر ہوگیا تو کوفہ میں اہل بیت کے طرفداروں نے حسین رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ان کے یہاں آجائیں، وہ لوگ اس کے معاملہ کو اٹھائیں گے، اس وقت حسین رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ یزید پر خروج اس کے فسق وفجور کی وجہ سے ضروری ہے خصوصاً اس آدمی کے لیے جسے اس پر قدرت ہے، اور حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیت اور شوکت کی وجہ سے قدرت وطاقت کا خیال کیا، جہاں تک اہلبیت کا تعلق ہے، وہ ان کے گمان کے مطابق بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی مگر شوکت کے بارے میں انہوں نے غلط سوچا اس بارے میں اللہ ان پر رحم کرے‘‘۔

اس کے بعد علامہ ابن خلدون نے شوکت میں غلطی کی وجہ بیان کی ہے کہ قبیلہ مضر کی عصبیت سمٹ سمٹا کر قریش کے قبیلہ بنی امیّہ کے اندر آگئی تھی، مگر اسلام نوبت اور وحی کی برکتوں کی وجہ سے اس پر پردہ پڑ گیا تھا، اور جب نبوت اور وحی کا انقطاع ہوگیا، اور عہد رسالت سے دوری ہوگئی، تو پھر بنوامیّہ کی پرانی عصبیت عود کر آئی، مگر شوکت کے بارے میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ کے خلاف سوچنا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہے، اور لوگ دین ودیانت کا ساتھ دے کر اس اقدام میں میری ہمنوائی کریں گے، ان کے لیے کسی صورت میں معیوب ونقصان دہ نہیں ثابت ہوا۔

" فقد تبين لك غلط الحسين الا انه فى امر دنيوى لا يضره الغلط فيه ، واما الحكم الشرعى فلم يغلط فيه لانه منوط بظنه وكان ظنه القدرة على ذلك "۔ (ص :۱۸۱)

"اس تفصیل سے تم کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اندازہ کی غلطی معلوم ہوگئی، مگر یہ غلطی دنیاوی امر میں ہوئی، اور یہ دنیاوی و سیاسی غلطی ان کے لیے نقصان دہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ان کے اندازہ کی وجہ سے ہوئی، آپ کا اندازہ تھا کہ یزید پر خروج کی قدرت وطاقت ہے"۔

ارباب دین و دیانت کے نزدیک ارباب عزیمت کے اس قسم کے غلط اندازے کسی طرح معیوب ونقصان دہ نہیں ہوتے، مگر اہل حق کے کارناموں پر پردہ ڈالنے والے غلط کار جانبداروں کے نزدیک یہی باتیں عیب جوئی اور بہتان طرازی کے لیے بہانہ بن جاتی ہیں، اور وہ ان کو اپنے مزاج و ماحول کے مطابق رنگ وروغن دے کر پیش کرتے ہیں۔

ان دنوں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ میں اپنے طرفداروں کے نام ایک خط لکھا اور اپنے مولیٰ سلمان کے ہاتھ روانہ کیا ،اس خط کا مضمون یہ تھا:

" بسم الله الرحمٰن الرحيم ۔ من الحسين بن على الى مالك بن مسمع والاحنف بن قيس ، والمنذر ابن الجارود ، و مسعود بن عمرو ، و قيس بن الهيثم : سلام عليكم اما بعد فانى ادعوكم الى احياء معالم الحق اماتة البدع فان تجيبوا تهتدوا سبل الرشاد ، والسلام۔ (الاخبار الطوال ص : ۲۳۳)

"حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی طرف سے مالک بن مسمع ،احنف بن قیس، منذر بن ابی جارود و مسعود بن عمرو، اور قیس بن الہیثم کے نام السلام علیکم اما بعد میں تم لوگوں کو معالم حق کے احیاء اور بدعات کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہوں، اگر تم لوگوں نے اس دعوت کا جواب دے کر لبیک کہا تو رشد و ہدایت کی راہ پا کر ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ والسلام"۔

ان مسلمہ تصریحات سے ثابت ہو رہا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی دعوت یزید کے خلاف سراسر دین و دیانت کی دعوت تھی، اور اس میں کسی قسم کی نسلی یا خاندانی آمیزش نہیں تھی، نہ اس اقدام میں علی رضی اللہ عنہ کا بیٹا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ ہونے کی وجہ سے استحقاق کا تصور تھا، اور نہ ہی حب وجاہ اور دنیا طلبی کا جذبہ کام کر رہا تھا، نیز اس وقت جو صحابہ رضی اللہ عنہم سیدنا

حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ نکلے، اور نہ ہی ان کے اس اقدام پر نکیر کی وہ بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف[1] تھے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کے خلاف یہ اقدام صرف اس کے فسق و فجور کے ختم کرنے اور معالم حق کے اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ چنانچہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ عین یزید کے معرکہ میں شامی فوجوں کو للکار کر کہتے تھے، کہ میری دعوت و حیثیت کو تم لوگ ان اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے معلوم کرو جو میرے ساتھ نہ ہونے کے باوجود صورت حال سے اچھی طرح واقف ہیں، اور یزید اور میرے حالات کو جانتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

” وكان الحسين يستشهد بهم وهو يقاتل بكربلاء علیٰ فضله وحقه ويقول سلوا جابر بن عبد الله و ابا سعيد الخدرى وانس بن مالك وسهيل بن سعيد و زيد بن ارقم وامثالهم “۔ (مقدمه ابن خلدون ص :۱۸۱)

” اور جس وقت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں جنگ کر رہے تھے، اپنی فضیلت و اہلیت اور برحق ہونے پر ان ہی صحابہ رضی اللہ عنہم کو گواہ بناتے تھے، اور مقابل فوجیوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، انس بن مالک، سہیل بن سعید، زید بن ارقم اور ان جیسے دوسرے صحابہ سے پوچھ لو“۔

ان ہی واقعات و حقائق کی روشنی میں علامہ ابن خلدون نے نہایت واضح الفاظ میں یزید کے مقابلہ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام اور خروج کو برحق قرار دے کر ان کو شہید مثاب و قتیل برحق قرار دیا ہے، اور قاضی ابوبکر بن العربی مالکی اندلسی صاحب ”العواصم من القواصم“ (الاشعری) کا شدومد سے ردّ کر کے ان کی غلطی کو بیان کیا ہے، اور یزید کی کارستانیوں کو اس کے فسق و فجور کے لیے موکد بتایا ہے:

” بل هى فعلاته ، الموكدة لفسقه والحسين فيها شهيد مثاب وهو علیٰ حق واجتهاد ـــــ وقد غلط القاضى ابو بكر بن العربى المالكى فى هذا فقال فى كتابه الذى سماه بالعواصم والقواصم ما معناه ان الحسين قتل بشرع جده ، وهو غلط حملته عليه الغفلة عن اشتراط الامام العادل ، ومن اعدل من الحسين فى زمانه فى امامته و عدالته فى قتال اهل الآراء “۔ (مقدمة ص :۱۸۱)

”بلکہ حسین ؓ سے یزید کی جنگ ان حرکتوں میں سے ہے جو اس کے فسق وفجور کو موکد بناتی ہیں اور حسین ؓ اس میں شہید ہو کر اللہ سے اجر وثواب کے مستحق ٹھہرے اور وہ حق واجتہاد پر تھے، اور قاضی ابوبکر بن العربی مالکی نے اس مسئلہ میں غلطی کی اور اپنی کتاب العواصم والقواصم میں لکھ دیا کہ سیدنا حسین ؓ اپنے نانا کی شریعت کے مطابق قتل کئے گئے، حالانکہ یہ رائے غلط ہے، انہوں نے یہ غلطی اس لیے کی کہ وہ امام عادل کی شرط سے غافل ہو گئے، اور سیدنا حسین ؓ سے بڑھ کر ان کے زمانہ میں دوسرا کون شخص امامت وعدالت کے اعتبار سے اہل آراء کے قتال کے لیے اعدل و برحق ہو سکتا تھا؟“۔

اسی طرح امام ابن تیمیہ ؒ نے سیدنا حسین ؓ کو نہایت واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں بلند مرتبہ اور پاک نیت تسلیم کیا ہے، حالانکہ انہوں نے یزید یا اس جیسے خلیفہ وامیر کے خلاف خروج کو غلط قرار دیا ہے، کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے، اور عموماً اس کے نتیجہ میں اہل حق پر اہل باطل غالب آ جاتے ہیں، پھر بھی علامہ ابن تیمیہ ؒ نے ایسے مردان حق اور ارباب صدق وصداقت کو خاموش رہنے والوں کے مقابلہ میں بہتر قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”وهو اعظم قدرا عند الله واحسن نيتا من غيرهم“ (المنتقىٰ ص : ٢٨٦)

”ایسے لوگوں کی قدر ومنزلت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت زیادہ ہے، اور دوسروں کے اعتبار سے ان کی نیت بہتر ہے“۔

علامہ ابن تیمیہ ؒ نے سیدنا حسین ؓ کے مقابلہ میں یزیدی فوجوں کو ظالم وطاغی قرار دیتے ہوئے آپ کو شہید مظلوم بتایا ہے، اور یزیدی فوجوں کو ان کے قتل کا مجرم گردانا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

”بل تمكن اولئك الظلمة الطغاة من سبط رسول الله ﷺ حتى قتلوه مظلوما شهيدا“۔ (المنتقىٰ ص : ٢٨٧)

”بلکہ ان ظالموں سرکشوں نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے پر قبضہ پالیا یہاں تک کہ آپ کو ظلماً قتل کر کے شہید مظلوم بنا دیا“۔

آگے چل کر شہادت حسین ؓ کو شہادت عثمان ؓ کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وكان قتل الحسين مما اوجب الفتن كما كان قتل عثمان مما اوجب الفتن“۔ (ص : ٢٨٧)

’’اور شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے نتیجہ میں فتنے برپا ہوئے، جس طرح کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے نتیجہ میں فتنے برپا ہوئے[1]‘‘۔

ایک مقام پر یزیدی فوجوں کی شرارت اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی براءت کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آخر میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزیدی فوجوں سے امن وامان کی بات کی مگر انہوں نے آپ کو قتل کر ڈالا، ملاحظہ ہو:

” اراد الرجوع فادركته السرية الظالمة فطلب ان يذهب الیٰ يزيد او يذهب الى الثغور او يرجع الى بلدة يمكنوه من ذلك حتى يستاسر لهم ولكن وهو رضى الله عنه ابیٰ ان يسلم نفسه وان ينزل علیٰ عبيد الله بن زياد و قاتل حتیٰ قتل شهيدا مظلوماً رضى الله عنه “۔ (المنتقیٰ ص : ۲٦۷)

’’آپ نے کربلاء سے واپسی کا ارادہ کیا تو ظالم دستہ نے آپ کو پا لیا، آپ نے یزید کے پاس جانے کی مہلت طلب کی یا صحرا یا سرحد کی طرف میں چلے جانے یا پھر اپنے شہر مدینہ میں لوٹ جانے کی پیشکش کی، مگر انہوں نے ان تین باتوں میں سے کسی ایک کو نہ ہونے دیا اور یہ کہ آپ پہلے ان کے قیدی بن جائیں مگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے کو ان کے حوالے کرنے سے اور عبید اللہ بن زیاد کے پاس جانے سے انکار فرمایا اور جنگ کی یہاں تک کہ قتل کر دیئے گئے، اور شہید مظلوم ہو گئے‘‘۔

علامہ ابن خلدون اور علامہ ابن تیمیہ کی ان تصریحات کے بعد سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام خروج اور موقف کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور اس حقیقت پر پردہ ڈالنا آفتاب پر خاک ڈالنے کے مترادف بن جاتا ہے۔

امن وصلح کی کوشش اور اتمام حجت

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے پوری زندگی امن وصلح کی بحالی کے لیے قربانیاں دیں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اپنے حق سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوئے، اور دونوں بھائیوں نے نہایت خوش دلی اور رضامندی سے نبھایا، اور ہر طرح ان کا ساتھ دے کر اپنی طرف سے حجت تمام کر دی، اور دوسروں کے خلاف امن وصلح سرگرمیوں سے برابر روکا۔

جن لوگوں نے ان حضرات کو ورغلایا، ان کا جواب نہایت سنجیدگی اور صفائی کے ساتھ دیا، چنانچہ جب حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور عبیدہ بن عمرو نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو اس پر عار دلایا اور ورغلایا تو آپ نے ان کو جواب دیا:

” قد بايعنا و عاهدنا ولا سبيل الى نقض بيعتنا “ (اخبار الطوال ص :۲۳۳)

”ہم معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے اس سے عہد کر چکے ہیں، اور ہماری بیعت کے توڑنے کی کوئی سبیل نہیں ہے“۔

علی بن محمد بن ہمدانی کا بیان ہے کہ میں اور سفیان بن معاذ دونوں مدینہ میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، اس وقت ان کے پاس مسیّب بن عتبہ اور عبداللہ بن دواک تمیمی اور سراج بن مالک خشعمی موجود تھے، میں نے کہا السلام علیک یا مذل المومنین (تم پر سلام ہو اے مومنوں کے ذلیل کرنے والے) سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

” اجلس، [لست مذل المؤمنين، ولكنى معزهم، ما اردت بمصالحتى معاويه الا ان ادفع عنكم القتل عند ما رايت من تباطؤ اصحابى عن الحرب، ونكولهم عن القتال، وو الله لئن سرنا اليه بالجبال والشجر ما كان بد من إفضاء هذا الأمر اليه “.

”وعلیک السلام، بیٹھ جاؤ میں مومنوں کو رسوا کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ ان کو معزز بنانے والا ہوں، میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے اس کے سوا کوئی ارادہ نہیں کیا کہ تم لوگوں سے کشت وخون کو دفع کروں، کیونکہ میں نے اپنے لوگوں کی جنگ سے سستی اور ان کے اس سے کترانے کو دیکھا اللہ کی قسم اگر ہم معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہاڑوں اور درختوں کی فوج لے کر جائیں گے تب بھی اس معاملہ کے جاری کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے“۔

حسن رضی اللہ عنہ سے یہ جواب پانے کے بعد ہم لوگ وہاں سے نکل کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے جوب کی خبر دی تو انہوں نے کہا:

” صدق ابو محمد، فليكن كل رجل منكم حلسا [١] من احلاس بيته، ما دام هذا الإنسان حيا “.

”ابو محمد (سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) نے سچ کہا، تم لوگوں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے گھر کا فرش بن جائے، جب تک یہ انسان زندہ ہے“۔ (اخبار الطوال ص: ۲۲۱)

اس کے بعد جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا، اور اہل کوفہ کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے پاس اس مضمون کا خط لکھا کہ ہمارے یہاں کے شیعہ (طرفداران اہل بیت) آپ کی طرف نظر جمائے ہوئے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر لئے بیٹھے ہیں، وہ آپ کے برابر کسی دوسرے کو نہیں سمجھتے، ان کو آپ کے بھائی حسن رضی اللہ عنہ کی رائے جنگ کے دفع کرنے کے بارے میں معلوم ہے، اور وہ آپ کی نرمی اپنے دوستوں کے حق میں اور سختی اپنے دشمنوں کے حق میں

پہچان چکے ہیں، اگر آپ اس امر خلافت کو طلب کرنا پسند کرتے ہیں تو ہمارے پاس آجائیے، ہم نے آپ کے ساتھ اپنے کو موت کے لیے پوری طرح تیار کر رکھا ہے"۔

اس خط کا جواب سیدنا حسین ؓ نے ان الفاظ میں دیا:

" اما أخي فأرجو ان يكون الله قد وفقه، وسدده فيما ياتى، واما انا فليس رأيي اليوم ذلك، فالصقوا رحمكم الله بالأرض، واكمنوا في البيوت، واحترسوا من الظنه ما دام معاويه حيا، فلن يحدث الله به حدثا وانا حي، كتبت إليكم برأيي والسلام ". (اخبار الطوال ص : ۲۲۲)

"میرے بھائی کے بارے میں مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی اور درست راہ دکھائی باقی رہا میرا معاملہ تو آج یہ میری یہ رائے نہیں ہے، اللہ تم پر رحم کرے، تم لوگ زمین سے لپٹ جاؤ اور گھروں میں چھپ رہو، اور جب تک معاویہ ؓ زندہ ہیں، فتنے سے بچتے رہو، اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے معاویہ ؓ کے سلسلہ میں کوئی نئی بات پیدا فرما دی ہو تو میں زندہ رہا تو تمہارے پاس بھی اپنی رائے لکھ بھیجوں گا"۔

ان واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سیدنا حسین ؓ نے امن و صلح اور عہد و پیمان کے لیے کیا کیا۔

اعتراف واحترام

خود سیدنا معاویہ ؓ سیدنا حسین ؓ کی طرف سے ہر طرح مطمئن تھے، اور ان کی بیعت پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے، بلکہ اپنے عمّال کو ان کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے روکتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک معاملہ میں کوفہ کے کچھ اعیان واشراف سیدنا حسین ؓ کے پاس مدینہ منورہ آئے، اور چند دنوں تک رہ کر ان کے پاس آتے جاتے رہے، اس وقت مدینہ کا گورنر مروان بن حکم تھا، اس کی خبر شدہ شدہ اس کے پاس پہنچی، اس نے اس صورت حال کو خطرناک سمجھتے ہوئے سیدنا معاویہ ؓ کو لکھا کہ عراق سے کچھ لوگ یہاں حسین ؓ کے پاس آئے ہیں اور وہ ان کے پاس مقیم ہیں، اس بارے میں آپ مجھے مشورہ دیجئے سیدنا معاویہ ؓ نے بڑے انشراح اور وثوق واعتماد کے ساتھ مروان کو لکھا:

"لا تعرض للحسين في شيء، فقد بايعنا، وليس بناقض بيعتنا ولا مخفر ذمتنا ".

"تم کسی معاملہ میں حسین ؓ سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو کیونکہ انہوں نے ہماری بیعت کر لی ہے، اور وہ نہ ہماری بیعت

توڑنے والے ہیں اور نہ ہمارے عہد کو ذلیل کرنے والے ہیں''۔ 1

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو یہ لکھا اور خود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو یہ خط لکھا ہے:

" اما بعد، فقد انتهت الى امور عنك لست بها حريا، لان من اعطى صفقه يمينه جدير بالوفاء، فاعلم رحمك الله انى متى أنكرك تستنكرنى، ومتى تكدني اكدك، فلا يستفزنك السفهاء الذين يحبون الفتنة والسلام ".

''اما بعد آپ کی طرف سے میرے پاس چند ایسی باتیں پہنچی ہیں جو آپ کے شایان شان نہیں ہیں، کیونکہ جس نے اپنا ہاتھ دے دیا اسے وفاداری کرنی چاہیے۔۔۔۔۔۔۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس مکتوب کے جواب میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے نہایت ہی بلیغ اور جامع جواب لکھا، جس میں اپنی وفاداری اور ذمہ داری کا اعلان فرمایا:

" ما اريد حربك، ولا الخلاف عليك ".

''میں آپ سے نہ جنگ چاہتا ہوں اور نہ آپ سے اختلاف کرنا چاہتا ہوں''۔

اس کے بعد علامہ ابوحنیفہ دینوری نہایت واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

" ولم ير الحسن ولا الحسين طول حياه معاويه منه سوءا في أنفسهما ولا مكروها، ولا قطع عنهما شيئا مما كان شرط لهما، ولا تغير لهما عن بر ". (اخبار الطوال ص :۲۲۵)

''حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی بھر ان کی طرف سے اپنے بارے میں کوئی برائی نہیں دیکھی اور نہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان دونوں حضرات سے ایسی چیز (وظیفہ وغیرہ) بند کی جس کی ان کے لئے شرط لگائی تھی اور نہ ہی ان حضرات کے ساتھ حسن سلوک میں فرق آنے دیا''۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت وامارت کے پورے زمانہ میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت ومروّت کا رویہ رکھا، اور ان حضرات نے بھی نہایت ذمہ داری سے بیعت صلح کو فرض کے ساتھ نبھایا، اور جب کبھی ان کے طرفداروں نے ورغلایا تو ان کو صاف صاف جواب دیا گیا کہ ہم صلح اور بیعت کے بد عہدی اور بے وفائی نہیں کر سکتے، بھائی کی وفات کے بعد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے تمام باتوں کو قائم رکھا، اور ان میں سرمو

فرق نہ آنے دیا، اسی طرح سیدنا معاویہ ؓ نے بھی ان کا پورا پورا لحاظ واحترام فرمایا۔ [1]

اس کے بعد جب سیدنا معاویہ ؓ ۶۰ ہجری میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس حالت میں بھی ان کو خاص طور سے سیدنا حسین ؓ کا خیال رہا، چنانچہ انہوں نے یزید کو وصیت کے لیے یاد فرمایا، مگر وہ اس وقت شہر دمشق سے غائب تھا، اور جب انتظار کے بعد نہ آیا تو اپنے پولیس افسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے ۔۔۔۔۔محافظ مسلم بن عقبہ کو بلایا، اور ان سے کہا کہ میری یہ باتیں یزید کو پہونچا دینا سیدنا معاویہ ؓ نے جہاں یزید کو اور باتوں کی وصیت کی وہاں پر یہ بھی فرمایا مجھے چار آدمیوں کی طرف سے خطرہ ہے ان میں سے ایک حسین بن علی ؓ بھی ہیں، مگر بہر حال ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا ضروری ہے:

” فاما الحسين ابن على فاحسب اهل العراق غير تاركيه حتى يخرجوه ، فان فعل، فظفرت به، فاصفح عنه “ (اخبار الطوال ص : ۲۲۶)

”رہا حسین بن علی ؓ کا معاملہ تو میرا خیال ہے کہ اہل عراق ان کو چھوڑنے والے نہیں ہیں، پس اگر وہ تمہاری مخالفت بھی کریں اور تم ان پر قابو بھی پاؤ تو ان سے درگذر کرنا“۔

امن وصلح خطرے میں

مگر جب یزید کو تختِ امارت مل گیا تو اس نے سب سے پہلا حکم یہی دیا کہ ان چاروں کی بیعت فوراً زبردستی لی جائے، اور اس میں کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے اور نہ دیر ہونے پائے۔

” فلم تكن ليزيد همه الا بيعه هؤلاء الأربعة “۔

”جس وقت یزید امارت وخلافت کا مالک ہوا ان چاروں کی بیعت کے علاوہ اس کو کوئی دھن نہیں تھی“۔

چنانچہ اس نے مدینہ کے عامل ولید بن عتبہ بن ابوسفیان (اپنے چچا) کو لکھا:

” ان يأخذهم بالبيعه أخذا شديدا لا رخصه فيه “۔

”ان چاروں سے سخت قسم کی بیعت لے اس میں ذرا مہلت نہ ہونے پائے“۔ (ص: ۲۲۷)

یزید کا یہ تند وتیز اور ناعاقبت اندیشانہ اور باپ کی وصیت کے خلاف خط دیکھ کر ولید بہت گھبرائے، کیونکہ اس سے فتنہ کا

ڈر تھا، انہوں نے مروان سے مشورہ کیا، مروان بڑا چالاک تھا، اس نے بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت لینے اور انکار پر قتل کر دینے کا مشورہ دیا نیز اس نے کہا:

” ولكن عليك بالحسين بن على وعبد الله بن الزبير، فابعث إليهما الساعة، فان بايعا والا فاضرب أعناقهما قبل ان يعلن الخبر، فيثب كل واحد منهما ناحيه، ويظهر الخلاف “.

”تم حسین بن علی رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو پکڑو، اور اسی وقت ان کو بلوا بھیجو اگر وہ دونوں بیعت کرلیں تو خیر ورنہ اس سے پہلے ان دونوں کی گردن مارو کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر عام ہو، اور ان دونوں میں سے ہر ایک کسی علاقہ میں اچھل پڑے، اور مخالت ظاہر کرنے لگے“۔

ولید سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی پالیسی کے آدمی تھے، طبعاً صلح پسند تھے، اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا بڑا احترام کرتے تھے، انہوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا، اور دارالامارۃ میں مروان کے سامنے یزید کا خط سنا کر بیعت کے بارے میں بات کی، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

” ان مثلي لا يعطى بيعته سرا، وانا طوع يديك، فإذا جمعت الناس لذلك حضرت، وكنت واحدا منهم “.

”مجھ جیسا آدمی چھپ کر بیعت نہیں کرتا، میں تو آپ کے ہاتھ میں ہوں، جب آپ اس کام کے لیے عام لوگوں کو جمع کرلیں گے تو میں حاضر ہو کر ان میں ہو جاؤں گا“۔ (ص:۲۲۸)

ولید نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی صاف ستھری اور دانشمندانہ بات سن کر کہا کہ اچھا اس وقت جائیے، اور لوگوں کے ساتھ پھر ہمارے پاس آئیے گا، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے چلے جانے کے بعد مروان نے ولید سے کہا کہ تم نے میری بات نہیں مانی، اللہ کی قسم اب امکان جاتا رہا، مروان کی ان باتوں کو سن کر ولید نے نہایت صفائی سے کہا:

”اے مروان! تم پر افسوس ہے، کیا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا اشارہ کرتے ہو، اللہ کی قسم جس آدمی کا محاسبہ قیامت کے دن حسین رضی اللہ عنہ کے خون کے بارے میں ہوگا اس کے اعمال کا ترازو اللہ کے یہاں ہلکا ہوگا“۔ (اخبار الطوال ص:۲۲۸)

ان بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی بیعت سے کوئی عذر نہیں تھا، البتہ وہ چار آدمیوں سے

خفیہ اور زبردستی بیعت لینے کے خلاف تھے، اور چاہتے تھے کہ یہ بیعت اہل مدینہ اور مہاجرین وانصار کے مجمع میں ہو جیسا کہ اب تک یہی ہوتا رہا ہے، بلکہ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ مروان نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے قتل کرنے کی بات سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے ہی ولید سے کہی، جس کا آپ نے فوراً جواب دیا، تاریخ ابن خلدون میں ہے:

”مروان بولا، ان کو بغیر بیعت کئے ہوئے نہ جانے دو، ورنہ ان جیسے شخص سے بیعت نہ لے سکو گے جب تک تم میں اور ان میں خون کا دریا نہ رواں ہوگا، اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں لپک کر ان کی گردن اڑا دوں گا، اس فقرے کے تمام ہوتے ہی حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے ڈانٹ کر کہا: ”تو مجھے قتل کر دے گا؟ واللہ تو جھوٹا ہے“ مروان یہ سن کر دب گیا، آپ لوٹ کر اپنے مکان پر تشریف لائے، مروان ولید کو ملامت کرنے لگا“۔ (ترجمہ تاریخ ابن خلدون ۶۹ / ۵)

اس یزیدی اور مروانی سیاست کے مقابلہ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی دیانت وامانت اپنے کو ہر طرف سے غیر محفوظ پا رہی تھی، جس کی وجہ سے حالات کو رخ بدلنے لگا، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی عزت وآبرو اور جان بچانے کی غرض سے مدینہ منورہ کو خیر باد کہا، انہوں نے ولید سے اس کا اظہار بھی کیا تھا، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

”باقی رہے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وہ اپنے اعزہ واقارب کو مجتمع کر کے اپنے مکان میں چھپ رہے، ولید آدمی پر آدمی بلانے کو بھیجنے لگا، آخر الامر اپنے غلاموں کو ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے گرفتار کر لانے پر متعین کیا، غلاموں سے سخت وسست کہا، چاروں طرف سے مکان کو گھیر لیا، ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے مجبور ہو کر اپنے بھائی جعفر کے ذریعہ ولید کے پاس کہلا بھیجا، تمہارے غلاموں نے میری بے عزتی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، تم ذرا صبر کرو، میں کل آؤں گا، تم اپنے غلاموں اور آدمیوں کو بلا لو، ولید نے اپنے غلاموں کو واپس بلا لیا“۔ (ص:۶۹-۷۰)

اس کے بعد ابن زبیر رضی اللہ عنہما عزت وآبرو اور جان بچانے کے لیے رات کو مکہ روانہ ہو گئے، اور ولید نے ان کے تعاقب میں آدمی روانہ کئے، ان آدمیوں نے ناکام واپس آ کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا، علامہ ابن خلدون کا بیان ہے:

”تمام دن یہ لوگ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو تنگ کرتے رہے، ولید بار بار آپ کو بلا بھیجتا تھا، اور آپ نہ جاتے تھے، پھر آپ نے آخر میں کہلا بھیجا، رات کا وقت ہے، اس وقت صبر کرو، صبح ہونے دو، دیکھا جائے گا“۔ (ص:۷۰)

اس طرح ابن زبیر ؓ کے نکل جانے کے بعد سیدنا حسین ؓ پر مشق سیاست ہونے لگی، اوران کے لیے بھی عزت و آبرو سے اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ رہنا خطرہ میں پڑ گیا۔

سیدنا محمد بن الحنفیہ ؒ کا مشورہ

سیدنا حسین ؓ کے بھائی محمد بن حنفیہ ؒ تمام صورت حال سے اچھی طرح آگاہ تھے، انہوں نے اپنے بھائی سیدنا حسین ؓ کو مدینہ سے عزت وآبروہ کے ساتھ جان بچا کر نکل جانے کا مشورہ دیا، اور سیدنا حسین ؓ نے ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے مکہ کی راہ لی تھی، علامہ ابن خلدون کا بیان ہے:

”صرف محمد بن الحنفیہ ؒ رہ گئے، مکہ معظّمہ جانے کی محمد بن الحنفیہ ہی نے رائے دی تھی، کہ تم یزید کی بیعت سے اعراض کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جاؤ اور وہاں سے اپنے دعاۃ کو اطراف وجوانب بلاد اسلامیہ میں روانہ کرو، اگر وہ لوگ تمہاری بیعت منظور کرلیں تو اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرنا، اور اگر تمہارے سوا انہوں نے متفق ہو کر کسی دوسرے کو امیر بنالیا تو تم کو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا، نہ تمہارے دین کو مضرت پہونچے گی، اور نہ تمہاری عقل کو، نہ اس میں تمہاری آبروریزی ہوگی، مجھے اندیشہ اس کا ہے کہ کہیں تم ایسے شہر یا ایسی قوم میں نہ چلے جاؤ جس میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ، اور کچھ لوگ تمہارے مخالف ہوں، اور جس سے بدی کی ابتدا تم ہی سے ہو حسین بن علی ؓ نے دریافت کیا، اچھا ہم کہاں جائیں، جواب دیا مکہ جاؤ، اگر تم کو انہیں کے ساتھ یہ باتیں وہاں حاصل ہوجائیں تو فبہا ورنہ ریگستان اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں چلے جانا، اور ایک شہر سے دوسرے شہر کا رخ کرنا، یہاں تک کہ کوئی امر لوگوں کے اجتماع و اتفاق سے طے ہوجائے، حسین بن علی ؓ نے اس رائے کو پسند کیا، بھائی سے رخصت ہو کر نہایت سریع السیر ی کے ساتھ مکہ آپہونچے“۔ (ص ۷۰)

اس مشورہ کے بعد سیدنا حسین ؓ نے دوسری رات کو دار وگیر سے بچتے ہوئے اپنے وطن مدینہ منورہ کو خیر باد کہا، جس کے بعد پھر ان کو اس کی طرف واپسی نصیب نہ ہوسکی۔ علامہ دینوری لکھتے ہیں:

”جب شام ہوگئی اور رات کی سیاہی چھا گئی تو سیدنا حسین ؓ بھی مکہ مکرمہ کی طرف چلائے، ان کے ہمراہ ان کی دو بہنیں ام کلثوم اور زینب اور بھائیوں کے بیٹے ابوبکر، جعفر، عباس، اور آپ کے اہل بیت سے جو لوگ مدینہ میں تھے سب کے سب نکلے، صرف ان کے بھائی محمد بن حنفیہ ؒ نہیں نکلے اور وہیں مقیم رہے“۔ (الاخبار الطوال ص: ۲۳۰)

مسلم بن عقیل رحمہ اللہ بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہی مدینہ سے مکہ چلے آئے تھے، ادھر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما مکہ معظّمہ پہونچے، اور ادھر مدینہ منورہ میں وہی تماشا برپا ہوگیا، جس کے خوف سے یہ حضرات نکلے تھے۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

’’ان واقعات کی اطلاع یزید کو ہوئی تو اس نے ولید بن عقبہ کو مدینہ منورہ کی حکومت سے معزول کر کے عمرو بن سعید الاشدق کو مامور کیا، چنانچہ عمرو بن سعید ماہ رمضان المبارک ۶۰ ہجری میں داخل مدینہ ہوا، اس نے محکمہ پولیس کی افسری عمرو بن الزبیر کو دی، اس وجہ سے کہ ان میں اور ان کے بھائی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما میں کسی وجہ سے ناچاقی وکشیدگی تھی، چنانچہ اس نے اسی وجہ سے مدینہ منورہ کے چند لوگوں کو جو ہوا خواہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تھے، گرفتار کرا کے چالیس سے پچاس ساٹھ درّے تک پٹوائے، ازانجملہ منذر بن الزبیر، اور ان کا لڑکا محمد اور عبدالرحمن بن الاسود بن عبدیغوث، عثمان بن عبداللہ بن حکیم بن حزم، محمد بن عمار بن یاسر وغیرہم تھے، بعد اس کے عمرو بن سعید نے سات سو یا اس سے زیادہ آدمیوں کو مکہ کی طرف روانہ کرنے کو مسلح ومرتب کیا، عمرو بن الزبیر سے ان کی افسری کی بابت مشورہ لیا، عمرو بن الزبیر نے جواب دیا، مجھ سے زیادہ کوئی شخص اس کام کے لیے موزوں نہ ہوگا، پس عمرو بن سعید نے عمرو بن الزبیر کو بسر افسری سات سو جنگ آوروں کے جس میں انیس بن عمرو الاسلمی بھی تھا، مکہ معظّمہ کی طرف روانہ کیا‘‘۔ (تاریخ ابن خلدون ۵ / ۷۱-۷۲)

مکہ پر فوج کشی کو دیکھ کر مروان جیسے سخت قلب انسان کا دل پسیج کیا اور وہ ملامت کر کے کہنے لگا، اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بیت اللہ کی حرمت کو حلال نہ کرو، عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے درگذر کرو، ساٹھ برس کی اس کی عمر ہوگئی، وہ کیا اس کی مخالفت کرے گا مروان کی ان ناصحانہ باتوں کو سن کر عمرو بن سعید نے کہا:

’’واللہ میں اس سے عین خانہ کعبہ میں لڑوں گا‘‘۔ (ص: ۲۷)

اس کے بعد عمرو بن سعید اور عمرو بن زبیر نے مکہ معظّمہ پر فوج کشی کی، اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مقابلہ کیا۔ بہرحال سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بھی مکہ آ کر اپنے خاندانی مقام ’’شعب علی رضی اللہ عنہ‘‘ میں قیام فرمایا، اور لوگ جوق درجوق ان کی زیارت کے لیے آنے لگے، اور اس درمیان میں کوئی ایسی بات نہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے اور نہ ہی سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوئی جس میں یزید کی امارت کے خلاف کسی قسم کا خطرہ تھا، مگر یزید نے مکہ مکرمہ کے پرانے

عامل کو معزول کر کے اس کی جگہ دوسرے کو مقرر کیا۔ علامہ دینوری الاخبار الطوال میں لکھتے ہیں:

''پھر یزید نے یحییٰ بن صفوان بن امیہ کو مکہ سے معزول کر کے عمرو بن سعید بن عاص بن امیّہ کو وہاں کا عامل بنایا''۔

(ص: ۲۳۰-۲۳۱)

یزید کے رجحان اور منشاء کی روشنی میں مدینہ منورہ کے عامل کو بدل دینا اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ مکرمہ میں پہونچتے ہی وہاں کی حکومت میں تبدیلی کی وجہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

جب اہل کوفہ کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ چلے جانے کی خبر لگی تو انہوں نے مشورہ کر کے اپنی طرف سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھا جو ۲۰ رمضان کو آپ کو ملا، مگر آپ نے اس خط کو کھولا تک نہیں اور اسے کوئی اہمیت نہ دی۔

"لم یمس الحسین یومه ذلك"۔ (الاخبار الطوال ص ۲۳۱)

''حسین رضی اللہ عنہ نے اس دن ان خطوط کو ہاتھ تک نہیں لگایا''۔

مگر جب خطوط کے انبار لگ گئے، اور اہل کوفہ کی طرف سے بے حد اصرار ہونے لگا تو آپ نے ان کو جواب دیا جس میں یہ تھا کہ میں اپنے بھائی مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو تحقیق کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔

اس کے بعد اس واقعہ کے مبادی شروع ہو گئے، جسے واقعہ کربلا یا شہادت حسین رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔

بحق اسلام صبر وضبط

مؤلف نے یزید کی سیرت کا تذکرہ کرنے کے بعد اس کے مقابلہ میں خروج کرنے والے کو قابل گردن زدنی اور جاہلیت کی موت مرنے والا اور حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منحرف قرار دینے کے لیے صفحہ ۶۰ سے ۶۶ تک چند احادیث و آثار کو نقل کیا ہے جن میں اطاعت امیر کا حکم دیا گیا ہے، اور خروج سے ممانعت کی گئی ہے، حالانکہ یہ تمام احادیث اس امیر و خلیفہ کے بارے میں ہیں جو کسی وجہ سے امر خلافت پر قابض و دخیل ہو جائے، اور عامۃ المسلمین مصالح دینیہ کی بنا پر اسے امیر و خلیفہ تسلیم کر لیں۔ یقیناً ایسے امیر و خلیفہ کے خلاف جو فی نفسہ اچھا ہو یا برا مگر جب اسے عامۃ المسلمین نے حالات کے تقاضے کی بنا پر پورے طور سے خلیفہ مان لیا ہو اور اس کی بیعت ہو گئی ہو تو اب خروج کی دعوت کرنا فتنہ کو دعوت دینا ہے، اور امت میں انتشار پیدا کرنا ہے، اس لیے اس کے خلاف خروج کے بجائے ایسی کاروائی کرنی چاہیے

جس سے اسلام کا بول بالا رہے، اور اپنے کسی اقدام سے اسلام کو نقصان نہ پہنچے چنانچہ ان ہی احادیث پر عمل کرتے ہوئے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یزید کے معاملہ میں خاموشی اختیار کی، جن کے نزدیک اس کے خلاف اقدام سے فتنہ کا ڈر تھا۔

اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ ابھی یزید کی بیعت تام نہیں ہوئی اور وہ عامۃ المسلمین کی طرف سے خلیفہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے، وہ اس کے خلاف اٹھے، انہوں نے کسی خلیفہ کے خلاف خروج نہیں کیا بلکہ عین اس وقت جبکہ ایک شخص خلافت پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، انہوں نے بھی بہتر صورت پیدا کرنے کی کوشش کی، باقی رہا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا پہلے ہی سے یزید کو ولی عہد بنا دینا تو یہ ان کا اجتہاد تھا، اور اس سے ان کا منشا بعد میں فتنہ وفساد کو روکنا تھا، مگر فی نفسہ ان کا یہ اقدام کوئی شرعی حجت نہیں تھا، اور نہ مسلمانوں نے اس وقت تک اس طرح کا اقدام کیا تھا، کہ کسی کو پہلے سے ولی عہد بنا کر بعد میں اس کو ولی عہدی کی بنا پر خلیفہ مان لیا ہو، ان کے نزدیک وامرھم شوریٰ بینھم کا قانون تھا، ولی عہدی کوئی چیز نہیں تھی، اس لیے ان کا یہ اقدام نہ خلیفہ کے خلاف خروج ہوا، نہ اطاعت امیر کے خلاف ہوا، نہ ان کی موت جاہلیت کی طرح انتشار وافتراق کی موت ہوئی اور نہ ہی وہ قابل گردن زدنی تھے۔

اور جن صحابہ رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں صبر وسکون سے کام لیا انہوں نے بحق اسلام ''ہر طرح کی اثرۃ'' اور حق تلفی دیکھتے ہوئے اسلام کی اجتماعیت اور وحدت کے لیے سب کچھ برداشت کیا، اگر اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کلی طور سے شامی غلبہ اور مضری عصبیت کے مقابلے پر آ جاتے تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہو جاتا، اور ایران وروم کی طاقتیں اس سے کیا فائدہ حاصل کر لیتیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہنسی، خوشی اور تسلیم ورضا کے طور پر اس نازک زمانہ میں خاموشی اختیار نہیں کی، بلکہ سینے پر پتھر رکھ کر اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کر کے اسلام کی عظمت وجمعیت کو باقی رکھا، اس سلسلہ میں چند احادیث وآثار ملاحظہ ہوں:

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: [قال لنا رسول الله ﷺ سترون اثرة و امورا تنكرونها قالوا فما تامرنا يا رسول الله ، قال ادوا اليهم حقهم وسلوا الله حقكم] (بخاری و مسلم)

''ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم لوگ عنقریب اثرہ اور ایسے معاملات دیکھو گے جن کو ناپسند کرو گے، اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ، ایسے زمانہ میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں آپ نے فرمایا تم ان کا حق ان کو ادا کرو

،اور اپنے حق کو اللہ سے طلب کرو“۔

حافظ ابن حجر نے اثرہ کی مختصر تفسیریوں کی ہے حاصلها الاختصاص بخظ دنیوی فتح الباری (۴/۳) یعنی اثرہ کا مطلب دنیاوی مفاد کو مخصوص کرنا ہے اور کسی چیز پر ایک آدمی کا حق ثابت ہوتے ہوئے، اسے خود لے لینا ہے یا اپنے اثر و طاقت سے دوسرے کو دے دینا ہے، ایسے زمانہ میں خلفاء کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زکوٰۃ ان کو دو، اور ان کے زیر انتظام جہاد میں اگر تم کو جانا پڑے تو جاؤ تاکہ اسلام کی طاقت پر زد نے پڑے، اور اپنے حقوق کے لیے اللہ سے دعا کرو اور ان سے مطالبہ و مقابلہ نہ کرو“۔

[عن اسید بن حضیرؓ ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللّٰہ استعملت فلانا ولم تستعملنی قال انکم سترون بعدی اثرة فاصبروا حتیٰ تلقونی] (بخاری ومسلم)

”سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ، آپ نے فلاں آدمی کو عامل بنایا، اور مجھے عامل نہیں بنایا، آپ نے فرمایا ”کہ تم لوگ میرے بعد ترجیح اور حق تلفی دیکھو گے پس صبر کرو، یہاں تک کہ مجھ سے ملو“۔

زبیر بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حجاج بن یوسف کے مظالم کی شکایت کی، تو انہوں نے سن کر فرمایا:

[اصبروا فانه لا یاتی علیکم زمان الا والذی بعده شر منه حتی تلقوا ربکم سمعته من نبیکم] (بخاری کتاب الفتن)

”تم لوگ صبر سے کام لو، کیونکہ اب تمہارے سامنے جو زمانہ بھی آئے گا اس کے بعد کا زمانہ اس سے برا ہو گا، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملو، یہ نصیحت میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہے“۔

ان احادیث و آثار میں جس میں اثرہ اور حق تلفی کی خبر دی گئی ہے، اس کے بارے میں کیا کیا جائے گا، اور خلافت و امامت کی ذمہ داریاں کن کے مناسب تھیں، اور کیسے کیسے لوگ عہدوں پر آئے ان کو چھپایا نہیں جا سکتا، پس اطاعت امیر کا حکم ہر حال میں اس لیے نہیں ہے کہ وہ خواہ کیسے ہی ہوں فی نفسہ مطاع ہیں، بلکہ صرف اسلامی جمیعت اور دینی وحدت کے بقاء و تحفظ کے لیے اس کا شدت سے حکم دیا گیا ہے، اور بحق اسلام، ہر قسم کے حالات برداشت کرنے اور

وحدت اسلامیہ کو برقرار رکھنے کو کہا گیا ہے، اور امیر وخلیفہ کے حالات برداشت کرنے اور وحدت اسلامیہ کو برقرار رکھنے کو کہا گیا ہے، اور امیر وخلیفہ کے اچھے برے ہونے سے قطع نظر کر کے اسلامی مفاد کو بچایا گیا ہے۔

یزید کی روش اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور جمہور امت کا موقف

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو خطا کار، غلط کار رجاہ طلب اور نسل وخاندان پر منصب کا دعویدار بتاتے ہوئے مولف نے یزید کو پاک سیرت نیکو کار بتایا ہے اور اس میں کسی ایسی خامی کا وجود نہیں تسلیم کیا، جس کی وجہ سے اس کے خلاف خروج جائز ہو، اور اسے بغاوت وسرکشی سے تعبیر نہ کیا جائے، بلکہ یہ بتانا چاہا ہے کہ صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ہوا خواہ ایسے برگزیدہ اور مسلمہ امیر وخلیفہ کے خلاف علم بغاوت لے کر اٹھے، اور دوسرے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور جمہور امت یزید سے راضی اور خوش تھے اور ان کو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی، چنانچہ مؤلف لکھتے ہیں:

”ہم عصر حضرات کو جن میں کثیر تعداد صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم کی شامل تھی، امیر یزید کی سیرت اور کردار میں کوئی خامی ایسی نظر نہ آتی تھی، جس کی بنا پر عقد بیعت خلافت ناجائز ٹھہرے، یا بعد بیعت ان کے خلاف خروج وبغاوت کا جواز نکالا جا سکے“۔ (ص ۴۱)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

”مگر ان میں سے کسی ایک صحابی نے بھی متفق علیہ خلیفہ کے خلاف خروج میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ کسی طرح نہیں دیا (ص: ۸) آگے چل کر لکھتے ہیں: کردار خلیفہ میں کوئی خامی یا برائی ایسی نہ تھی کہ اس کے خلاف خروج کا جواز نکالا جا سکتا (ص ۹۷)

حالانکہ جن مورخوں اور عالموں کو مؤلف نے سند امامت عطا کی ہے اور ان کو معتبر ومسلم تسلیم کیا ہے، ان ہی کی کتابوں میں یزید کے کردار اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور امت کے موقف کا بیان نہایت صفائی کے ساتھ موجود ہے، مگر اس کو مؤلف نے حسب عادت چھپا کر ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ مورخین ومولفین بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو باغی اور یزید کو خلیفہ برحق سمجھتے ہیں، یہاں پر ہم صرف علامہ ابن خلدون کی تصریحات پیش کرتے ہیں، اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں:

علامہ ابن خلدون نے یزید کو ولی عہد بنانے کی مصالح کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں پر چند ایسے معاملات ہیں جن کے بارے میں حق بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

[الاوّل منها ما حدث فی یزید من الفسق ایام خلافته فایّاك ان تظن بمعاویة رضی الله عنه انه علم بذلك من یزید فانه اعدل من ذلك و افضل بل كان یعذله ایام حیاته فی سماع الغناء وینهاه عنه ، وهو اقل من ذلك] (مقدمه ابن خلدون ص :۱۷۶-۱۷۷)

’’پہلا معاملہ یزید کے فسق کا ہے، جو اس کے زمانہ خلافت میں ظاہر ہوا خبردار تم معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان مت کرنا کہ وہ یزید کے فسق و فجور کو جانتے تھے کیونکہ وہ اس سے بالا و بلند تر ہیں کہ یزید کے فسق کو جان کر اسے ولی عہد بنائیں، بلکہ وہ اپنی زندگی میں یزید کو اس کے گانا سننے پر ملامت کرتے تھے، اور اس سے روکتے تھے حالانکہ گانا سننا فسق سے کم درجہ کا تھا‘‘۔

ویسے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اس کے دور کے لوگوں کے خیالات یزید کے بارے میں پہلے ہی سے مختلف تھے، مگر جب زمانہ امارت و خلافت میں اس کا فسق کھل کر منظر عام پر آ گیا تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے بارے میں اختلاف کیا، اور یہ اختلاف اس کے فسق و فجور کے بارے میں نہیں تھا، بلکہ اس بارے میں تھا کہ ایسی حالت میں اسے امیر و خلیفہ تسلیم کرنا چاہئے، اور اس کی بیعت کو باقی رکھنا چاہئے یا توڑ دینا چاہئے پھر ان کے اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ باہمت اور باعزیمت صحابہ رضی اللہ عنہم تو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور جمہور مسلمین نے اس کے فسق و فجور کے باوجود فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے ڈر سے کھل کر خروج نہیں کیا، بلکہ دعا کرتے رہے کہ یا تو اسے ہدایت نصیب ہو، یا پھر اس سے امت کو نجات مل جائے، علامہ ابنِ خلدون صحابہ رضی اللہ عنہم کے موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

[وكانت مذاهبهم فیه مختلفة ومما حدث فی یزید ما حدث من الفسق اختلف الصحابة حینئذ فی شانه فمنهم من رای الخروج علیه ونقض بیعته من اجل ذلك كما فعل الحسین وعبد الله بن الزبیر رضی الله عنهما ومن اتبعهما ، ومنهم من ابا لما فیه اثارة الفتنة وكثرة القتل مع العجز عن الوفاء لان شوكة یزید یومئذ هی عصابة بنی امیة ، وجمهور اهل الحل والعقد من قریش ، وتتبع عصبیة مضر اجمع وهی اعظم من كل شوكة ولا تطاق مقاومتهم فاقصروا عن یزید سبب ذلك واقاموا علی الدعاء بهدایته والراحة منه ، وهذا كان شان جمهور المسلمین] (مقدمه ص :۱۷۷)

’’یزید کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے خیالات مختلف تھے اور جب یزید میں فسق و فجور ظاہر ہوا تو اس وقت

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بارے میں اختلاف کیا، پس ایک جماعت یزید کے فسق و فجور کی وجہ سے اس کے خلاف خروج کرنے اور اس کی بیعت توڑنے کی قائل ہوگئی، جیسا کہ حضرات حسین و عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور ان کے ساتھیوں نے کیا، اور دوسری جماعت یزید کے خلاف خروج و نقض بیعت کی منکر تھی، اس لئے کہ اس سے فتنہ برپا ہوگا، اور قتل کی کثرت ہوگی، اور یہ اقدام کماحقہ کامیاب نہ ہوگا، کیونکہ اس وقت شوکت و طاقت بنوامیّہ میں تھی، اور جمہور اہل حل و عقد قریش سے تھے، نیز اسی کے ساتھ پورے قبیلہ مضر کی عصبیت بھی کام کر رہی تھی، جو سب سے بڑی طاقت تھی، اور ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، اسی وجہ سے دوسری جماعت خاموش رہی اور یزید کی ہدایت یا اس کے شر سے محفوظ ہوجانے کی دعا کرتی رہی، جمہور مسلمانوں کا یہی رویہ تھا''۔

ان تصریحات سے معلوم ہوجاتا ہے کہ جہاں تک یزید کے فسق و فجور کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نفرت کرنے کا تعلق ہے، اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم متفق تھے، اس میں اختلاف نہیں تھا، البتہ اس کے خلاف خروج کرنے میں ان کا اجتہادی اختلاف تھا''۔

یزید کے خلاف اقدام نہ کرنے والے صحابہؓ اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے نقطہ نظر کو علامہ ابن خلدون یوں واضح کرتے ہیں:

اور حسین رضی اللہ عنہ کے علاوہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم حجاز، عراق، اور یزید کے ساتھ شام میں تھے انہوں نے سوچا کہ یزید اگر فاسق ہے، مگر اس کے خلاف خروج جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے قتل و غارت اور خون خرابہ ہوگا، یہ سوچ کر وہ لوگ رک گئے، اور حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دے سکے، مگر ان حضرات نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر نہ نکیر کی، اور نہ ہی ان کو خطا کار کیا:

[ولا انكروا عليه ولا اثموه لانه مجتهد وهو اسوة المجاهدين]

''انہوں نے نہ حسین رضی اللہ عنہ پر کسی قسم کی نکیر کی اور نہ ہی ان کو گناہ گار بتایا کیونکہ وہ مجتہد تھے بلکہ مجتہدوں کے اسوہ تھے''۔

اور خود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کے ساتھ نہ دینے پر کچھ نہیں کہا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کی نکیر کی۔

[ولم ينكر عليهم قعودهم عن نصره ولا تعرض لذلك لعلمه انه عن اجتهاد منهم كما كان فعله عن اجتهادد منه]

''حسین رضی اللہ عنہ نے بھی ان حضرات کے اپنی نصرت سے بیٹھ جانے پر کسی قسم کی کوئی نکیر نہیں کی، اور نہ ہی کوئی تعرض کیا

کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ بات ان کے اجتہاد کی وجہ سے ہے، جیسا کہ خود حسین رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام اپنے اجتہاد سے کیا تھا''۔

یہی نہیں، بلکہ امام حسین رضی اللہ عنہ ان ''صادق اللہجہ، اور خالص النیّہ'' امن پسند بزرگوں کو پوری طرح اپنا ہمنوا تسلیم کرتے تھے، اور یزید کے مقابلہ میں ان کو اپنا طرفدار اور حامی سمجھتے تھے، چنانچہ عین معرکہ کربلا میں آپ نے شامی فوجوں کے سامنے ان جلیل القدر اور نامی گرامی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام لے لے کر اور اپنی حقانیت پر ان کو گواہ بنا کر کہا کہ ''تم لوگ میرے بارے میں جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، انس بن مالک، سہل بن سعد، زید بن ارقم رضی اللہ عنہم جیسے دیگر اجلّہ صحابہ سے پوچھ لو کہ وہ حضرات میرے متعلق کیا فرماتے ہیں، اور ان کی رائے یزید کے بارے میں کیا ہے؟''۔

اس میں شک نہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس اقدام سے منع کیا، اور اس کے خلاف مشورے دیئے، مگر یہ فہمائش اس لئے نہیں تھی کہ یزید خلیفہ عادل اور امام برحق ہے، اس کے خلاف خروج غلطی ہے، بلکہ ان کی تمام تر فہمائش سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو اس بات پر تھی کہ آپ جو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے اندر اس اقدام میں کامیابی کی طاقت وشوکت ہے تو آپ کا اندازہ صحیح نہیں ہے کیونکہ پوری طاقت وشوکت سمٹ کر بنوامیّہ میں آ گئی ہے، اور وہ اپنی طاقت کے مقابلہ میں کسی کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے:

[وكان ظنه القدرة على ذلك ، ولقد عذله ابن عباس ، وابن الزبير ، وابن عمر ، وابن الحنفية واخوه وغيره فى سيره الى الكوفة وعلموا غلطه فى ذلك] (مقدمه ابن خلدون ص : ۱۸۱)

''آپ کو اندازہ تھا کہ مجھے اس بات کی طاقت ہے، اور ابن عباس، ابن زبیر، ابن عمر اور ان کے بھائی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ نے ان کو کوفہ جانے پر سخت وسست لہجہ میں سمجھایا کیونکہ انہوں نے اس اندازہ میں ان کی غلطی کو جانا''۔

ان صاف وصریح بیانات کے بعد مؤلف خلافت معاویہؓ ویزید کا وہ گھروندا گر جاتا ہے جسے انہوں نے بزرگوں سے جرح وقدح کے عنوان سے صفحہ ۹۸ سے ص ۱۰۶ تک بتایا ہے، اور جگہ جگہ کہا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے غلط اقدام پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے روکا مگر وہ نہ مانے، مذکورہ بالا حضرات اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اگرچہ مصلحتاً یزید کے فسق وفجور کے باوجود اس کے خلاف خروج نہیں کیا لیکن، ان کے نزدیک یزید کے افعال مستحسن اور صحیح نہ تھے، بلکہ وہ ان کو اسی طرح غلط اور ناجائز سمجھتے تھے، جس طرح سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے:

[ولا تقولن ان یزید وان کان فاسقا ولم یجز هؤلاء الخروج علیه فافعاله عندهم صحیحة واعلم انما ینفذ من اعمال الفاسق ما کان مشروعا] (ص :۱۸۱)

’’خبردار تم ہرگز ہرگز یہ نہ کہنا کہ جب یزید فاسق تھا، اوران حضرات نے اس کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھا تو ان کے نزدیک یزید کے تمام اعمال صحیح تھے، تم کو سمجھنا چاہئے کہ فاسق و فاجر حکمران کے اعمال سے وامر وحکم نافذ ہوگا جو مشروع ہوگا‘‘۔

اس سے یہ بات بھی بالکل صاف ہوگئی کہ یزید کے خلاف خروج نہ کرنے والے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کے افعال و اعمال کو غلط سمجھتے تھے، البتہ امور شرعیہ مثلاً جہاد، قصاص وغیرہ کو اس کی طرف سے نافذ مانتے تھے، کیونکہ مسئلہ یہی ہے کہ فاسق حکمران کا امر شرعی واجب العمل اور نافذ ہوتا ہے۔ جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم، یزید کے فسق و فجور کے قائل ہونے کے باوجود اس کے خلاف خروج کو فتنہ وفساد اور قتل و غارت کا سبب بتا کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نصرت سے الگ رہے مگر دل سے ان کے ساتھ رہے، ان کے بارے میں کسی کو لب کشائی کا حق حاصل نہیں ہے، اور ان پر کسی قسم کا کوئی الزام نہیں رکھا جاسکتا، اسوۂ حسینی بھی ان کے بارے میں یہی ہے، اور شریعت کا حکم بھی یہی ہے۔

[ولا یذهب بك الغلط ان تقول بتاثیم هؤلاء بمخالفة الحسین و قعودهم عن نصره ، فانهم اکثر الصحابة وکانوا مع یزید ، ولم یروا الخروج علیه] (ص :۱۹۱)

’’تم کو غلطی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان حضرات کو حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کرنے اور ان کی مدد سے بیٹھ رہنے کی وجہ سے گنہگار کہو، کیونکہ اس نظریہ کے اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، اور یزید کے ساتھ رہ کر اس کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے ‘‘۔

اور وہ چونکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو برحق سمجھتے تھے، اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کربلا کے میدان کارزار میں بھی ان سے اپنے برحق ہونے پر استشہاد کرتے تھے، اس لئے بھی ان کے بارے میں کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔

[ولکل مجتهدون ، ولا ینکر علی احد من الفریقین فمقاصدهم فی البر و تحری الحق معروفة ، وفقنا الله للاقتداء بهم] (مقدمه ابن خلدون ص :۱۷۷)

’’تمام صحابہ رضی اللہ عنہم مجتہد برحق تھے، اور فریقین میں سے کسی پر نکیر نہیں کی جاسکتی، کیونکہ نیکی اور جستجوئے حق میں ان کے

ارادے اور نیتیں معلوم ومشہور ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی اقتداء کی توفیق دے۔ 1

علامہ ابن خلدون کے اس بیان سے اس بات کا فیصلہ ہوجاتا ہے کہ یزید کے کردار میں کوئی خرابی تھی یا نہیں تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ یزید کے ساتھ تھے یا نہیں تھے، اور اس کے خلاف خروج واقدام کا جواز تھا یا نہیں تھا اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس معاملہ میں کیا سمجھتے تھے، مؤلف علامہ ابن خلدون کو سب کچھ تسلیم کرتے ہیں، اور علامہ ابن خلدون کی یہ تصریحات کیا بتا رہی ہیں؟

یزید اور اس کی ولی عہدی وامارت

’’فرقہ یزید‘‘ مؤلف نے یزید کو صرف عالم، فاضل، متقی، پرہیزگار، پابند صوم وصلوٰۃ کریم النفس، حلیم الطبع، سنجیدہ، متین خادم خلق، حکمرانی اور سیرت وکردار میں متبع فاروق اعظم وغیرہ قرار دیا ہے۔

اور شیعہ دشمنی یا شیعوں کے اکاذیب واباطیل کے جواب میں یزید کو نبی، رسول نہیں بتایا، ورنہ قدیم زمانہ میں ردّ عمل کے طور پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور زید کو نبی، رسول تک مانا گیا ہے، اور یزید کے نام سے مستقل ’’فرقہ یزیدیہ‘‘ رائج ہوگیا تھا، اور جن گمراہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نبوت بلکہ الوہیت کا درجہ دیا، یہ فرقہ بھی ان کی مخالفت میں ان ہی کی راہ پر چلا، چنانچہ علامہ مقدسی بشاری (۳۷۵ھ) احسن التقاسیم فی فعرفتہ الاقالیم میں لکھتے ہیں:

’’بغداد میں غالی لوگ ہیں، جو حبّ معاویہ رضی اللہ عنہ میں بہت زیادتی کرتے ہیں، اسی طرح مشبہ اور بربہاء یہ بھی ہیں میں ایک دن واسط کی جامع مسجد میں تھا، لوگ ایک آدمی کے اردگرد جمع تھے، میں بھی اس کے پاس گیا، وہ کہہ رہا تھا کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا، اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے قریب بلائے گا اور ان کو اپنے پہلو میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے ان کی نقاب کشائی کرے گا (ویغلفه بیده) پھر ان کو مخلوق کے سامنے عروس کی طرح جلوہ گر کرے گا، میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ یہ کیوں ہوگا؟ اے گمراہ! کیا معاویہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے کی وجہ سے؟ تو نے جھوٹ کیا، یہ سنتے ہی اس نے کہا اس رافضی کو پکڑو پھر لوگ مجھ پر جھپٹ پڑے، مگر بعض معلموں نے میرا تعارف کرایا اور ان سے مجھ کو بچایا‘‘۔ (احسن التقاسیم ص ۱۲۶ طبع یورپ)

اسی طرح علامہ مقدسی بشاری رحمہ اللہ نے اصفہان کے لوگوں کی حمایت اور افراط وتفریط کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

’’اصفہان میں ایک آدمی کے بارے میں مجھ سے بیان کیا گیا کہ وہ بڑا عابد زاہد ہے، یہ سن کر میں نے اس کے یہاں حاضری کا قصد کیا، اور اپنے قافلہ کو پیچھے چھوڑ کر اس کے یہاں رات بسر کی، اور اس سے سوالات کرتا رہا، میں نے کہا کہ ’’صاحب‘‘ کے بارے میں آپ کا خیال ہے، یہ سنتے ہی وہ اس پر لعنت بھیج کر کہنے لگا کہ اس نے ہمارے سامنے ایسا مذہب پیش کیا ہے جسے ہم نہیں جانتے میں نے کہا وہ کیا ہے، اس نے کہا ’’صاحب‘‘ کہتا ہے کہ معاویہ مرسل (رسول) نہیں تھے، میں نے کہا، اور آپ کیا کہتے ہیں، اس نے کہا میں تو وہی کہتا ہوں جو اللہ عزوجل نے بتایا ہے، لا نفرق بين احد من رّسله (ہم اس کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے) ابوبکر رضی اللہ عنہ مرسل تھے، اور عمر رضی اللہ عنہ مرسل تھے، یہاں تک اس نے خلفائے اربعہ کا نام لے کر ان سب کو مرسل بتایا، پھر کہا ’’اور معاویہ رضی اللہ عنہ بھی مرسل تھے‘‘ میں نے کہا آپ ایسا نہ کہیں یہ چاروں حضرات خلفاء تھے، اور معاویہ رضی اللہ عنہ (بادشاہ تھے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے الخلافة بعدی الی ثلاثين سنة ثم تكون ملكا (خلافت میرے بعد تیس سال ہوگی پھر ملوکیت ہوجائے گی) یہ سن کر وہ شخص علی رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع کرنے لگا اور میرے بارے میں کہنے لگا یہ آدمی رافضی ہے، اگر میرا قافلہ نہ پہونچ گیا ہوتا تو وہاں کے لوگ مجھے اپنی گرفت میں لے لیتے، اور ان لوگوں کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں‘‘۔ (احسن التقاسیم ص ۳۹۹)

یہ حبّ معاویہ رضی اللہ عنہ میں غلو بیجا کی مثالیں تھیں، اب خود یزید کے بارے میں بیجا غلو کا بیان علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

[لم تعتقد انه من الخلفاء الراشدين كما قاله بعض الجهلة من الاكراد ، وكما قيل هو نبى فهولاء نظراء من ادعى نبوة عليى اوالٰهيته] (المنتقیٰ ص :۲۷۹)

’’ہم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ یزید خلفائے راشدین میں سے ہے، جیسا کہ بعض جاہل کردوں نے کہا، اور جیسا کہ کہا گیا کہ یزید نبی ہے، پس ایسا کہنے والے ان لوگوں کے مانند ہیں، جنہوں نے علی رضی اللہ عنہ کی نبوت یا ان کی الوہیت کا دعویٰ کیا ہے‘‘۔

محشی نے اس مقام پر لکھا ہے کہ یزید کو خلفائے راشدین میں ماننے والے یہ اکراد ہکاریہ تھے (جن کا مرکز موصل کے اوپر جبال ہکاریہ تھا، ان کے پاس ایک بزرگ شیخ عدی بن حسن (ولادت ۴۶۷ھ وفات ۵۵۷ھ) آئے، ان کا دل شیعوں کے یزید پر الزامات و مکذوبات سے تنگ ہو گیا تھا، انہوں نے ان کردوں میں اعلان کیا کہ یزید مسلمانوں کے

امام میں سے ایک امام ہے، اور اس کے اخلاق و کردار سے جو منسوب کیا جاتا ہے، اس کی کوئی صحت و سند نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ عدویہ میں بتایا ہے کہ شیخ عدی کا طریقہ بہتر تھا، ان کے خلفاء میں شیخ حسن نامی ایک بزرگ تھے، جن کو شیعوں نے قتل کر ڈالا اور بڑا فتنہ برپا ہوا، اس کے نتیجہ میں ہکاری کردوں شیخ عدی اور ان کے خلیفہ حسن کے بارے میں غلو کیا، نیز انہوں نے یزید کے بارے میں اس قدر غلو کیا کہ اس کی نبوت کے معتقد ہو گئے، یہ لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے زمانے تک اسی حالت پر رہے آپ نے ان کے لئے ''الرسالۃ العدویہ'' نامی کتاب لکھی، جس میں بتایا گیا شیخ عدی بن مسافر نیک آدمی تھے، اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کردوں کو اپنے اور یزید کے بارے میں غلوئے بے جا سے منع کرتے، ''رسالہ عدویہ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے یزید کی نبوت کے قائل ہونے کے بعد اسے خدا تک مان لیا، ان کو یزیدیہ کہتے ہیں، اور یہ لوگ شمالی عراق کے علاقہ سنجا اور روس کے علاقہ اردان میں بکثرت آباد ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگ دمشق، بغداد اور حلب کے اطراف میں بھی پائے جاتے ہیں۔ (حاشیہ ص ۲۷۹ و ۲۸۰)

قاضی تنوخی نے ''نشوار المحاضرہ'' میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں بغداد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بحث و مناظرہ جاری تھا، اور لوگ دو رایوں میں منقسم تھے، بغداد کے بھکاری دریائے دجلہ کے پل پر اس طرح کھڑے ہو کر سوال کرتے کہ ایک گروہ پل کے ایک سرے پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مناقب و فضائل سناتا اور دوسرا گروہ دوسرے سرے پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب و فضائل پڑھتا، اور دن بھر کی آمدنی شام کو دونوں گروہ مل کر آپس میں برابر تقسیم کر لیتے۔

''خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید'' نامی کتاب بھی آج علی رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ و یزید کی بحثوں کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے ناشروں اور کتب فروشوں کے لئے کمائی کا اچھا خاصہ ذریعہ بن گئی ہے، اور مؤلف (محمود احمد عباسی) کو شہرت جو ملی وہ الگ رہی۔

مؤلف (محمود احمد عباسی) کے خیالات

یزید کی مدح و منقبت میں مؤلف یوں رطب اللسان ہیں:

''علم و فضل، تقویٰ و پرہیز گاری، پابندیٔ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ امیر یزید حد درجہ کریم النفس، حلیم الطبع، سنجیدہ و متین

تھے، ایک عیسائی رومی مورخ نے ان کی سیرت کے بارے میں ان کے ہم عصر کا بیان ان الفاظ میں لکھا ہے الخ''۔ (ص ۴۹)

مؤلف کی قصیدہ خوانی کی حقیقت جلد ہی آنے والے بیانات سے ظاہر ہوگی، اور عیسائی رومی مورخ کی یزید کی مدح و منقبت کا راز کربلا کے پس منظر کے بیان میں کھلے گا، مزید ارشاد ہے:

''حکمرانی وفرمان روائی سے مطلب ومقصد امیر یزید کے نزدیک خدمتِ خلق تھا اور اس کی خدمت کا آئیڈیل ومطمح نظر امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عادلانہ وصالح حکومت وسیاست تھی''۔ (ص ۵۰)

مؤلف کا مطلب شاید یہ ہے کہ یزید کی حکومت خلافت فاروقی کے ہم پلہ تھی، حالانکہ کہاں فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور کہاں یزید بن معاویہ؟ اسی صفحہ پر مزید تاکید وتوثیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''امیر یزید کو حکومت وسیاسی امور میں ہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی پیروی کا اہتمام نہ تھا، بلکہ طرز معاشرت میں بھی ان کی مثال سامنے رکھتے''۔ (ص ۵۰)

یعنی یزید کی حکومت وسیاست اور کردار وسیرت سب کچھ فاروق اعظم کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔

یہ چند مثالیں ہیں جن میں مؤلف نے یزید سازی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اور جہاں تک مؤلف کی ان تحریروں کے غلط ہونے کا تعلق ہے، علمائے محققین اور جرح وتعدیل اور حضرات محدثین و مورخین کی تصریحات اس کے لئے کافی ہیں، نیز ہم ان کو علامہ ابن خلدوں جیسے بالغ نظر ومحتاط اور ناقد ومبصر مورخ کی تصریحات کے ذریعہ اسی کتاب میں ضمناً بیان کر چکے ہیں، علامہ ابن خلدون کے بیان کے بعد پھر کسی اور مورخ وامام کے بیان کی ضرورت نہیں رہ جاتی، اور مؤلف کو بھی علامہ ابن خلدون کی بات ماننی ہی پڑے گی، ان کے لئے اس میں کسی طرح انکار وابا کی گنجائش نہیں ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو گرانا اور یزید کو بڑھانا

مؤلف نے اپنی کتاب میں یزید کے فضائل اور مناقب میں وہ طومار باندھا کہ تلبیس وتزویر اور تصدیق کو ایک کر دیا، قاتل حسین ؓ عمر بن سعد کو تابعی پھر صحابی ثابت کرنے کے لیے اسماء الرجال وحدیث کو حسب منشاء استعمال کیا مروان بن

حکم کے فضائل کی لمبی چوڑی داستان سنائی، ابن زیاد کے مناقب میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، مگر اسی کے ساتھ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو صحابیت تک سے محروم کرنے کی تدبیر کی ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے:

”ان حقائق کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسا کہ ذکر ہو چکا سن و سال میں حضرت ابن جعفر سے کئی سال چھوٹے مثل برادر خورد کے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت صرف پانچ برس کی عمر کے تھے۔

[ادرک الحسین من حیاۃ النبی ﷺ خمس سنین او نحوھا](البدایہ والنہایہ:۱۵۰/۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں حسین رضی اللہ عنہ نے پانچ سال کا زمانہ پایا تھا یا اس کے قریب اتنی چھوٹی سی عمر میں تمیز نہیں ہوتی، بعض ائمہ نے تو ان کے بڑے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو جو ان سے سال بھر کے قریب بڑے تھے زمرۂ صحابہ کے بجائے تابعین میں شامل کیا ہے۔

[وقد روی صالح بن احمد بن حنبل عن ابیه انه قال فی الحسن بن علیؓ انه تابعی ثقة وهذا غریب فلان یقول فی الحسین رضی الله عنه انه تابعی بطریق الاولی] (البداية والنهاية : ۱۵۰)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے فرزند صالح نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما ثقہ تابعی تھے یہ قول غریب ہے، تاہم حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدرجہ اولیٰ کہا جائے گا کہ وہ تابعی تھے زمرہ صحابہ میں شامل نہ تھے۔ (ص ۱۴۶ کی اردو عربی عبارت اور ترجمہ ختم ہوا)

مؤلف نے اس عبارت میں دجل وفریب صرف اس لئے کیا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو صحابی کے بجائے تابعی ثابت کر کے ان کے مرتبہ کو گھٹائیں، اور ان کے مقابلہ میں یزید، عمر بن سعد، مروان، ابن زیاد وغیرہ کو افضل و برتر ثابت کریں، مؤلف نے حسب عادت اس کے لئے علامہ ابن کثیر کی عبارت میں قطع و برید کی، اور ترجمہ غلط کیا، اس سے اوپر عبارت یہ ہے:

[وقد ادرک الحسین من حیاۃ النبی ﷺ خمس سنین او نحوھا ، و روی عنه احادیث وقال مسلم بن الحجاج له روایة عن النبی ﷺ]

”حسین رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے پانچ سال پائے یا اس کے قریب اور انہوں نے آپ سے کئی احادیث نقل

کیں، اور امام مسلم بن حجاج نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی روایت ثابت ہے‘‘۔ [1]

اس کے بعد علامہ ابن کثیر نے وہ عبارت لکھی ہ جسے مؤلف نے درج کیا ہے، اور اپنے ذوق کے مطابق ترجمہ کرتے ہوئے لکھا ہے، ’’یہ قول غریب ہے، تاہم حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدرجہ اولیٰ کہا جائے گا‘‘ اس ترجمہ میں مؤلف نے دو حرکتیں کی ہیں ایک تو یہ قول غریب ہے، کہہ کر تلبیس کی ہے، لغت میں ’’قولِ غریب‘‘ انکار و تعجب کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کا ترجمہ ایسے لفظ سے کرنا چاہئے جو انکار و تعجب کو ظاہر کر سکے، ’’قول غریب‘‘ کہہ دینا قارئین کو دھوکہ میں رکھنے کے مرادف ہے، دوسرے ’’فلان یقول‘‘ کا یہ مفہوم نہیں ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے، تابعی کے غریب و منکر قول کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بدرجہ اولیٰ تابعین میں شمار کرنا پڑے گا، حالانکہ یہ قول ہی سرے سے نادر و منکر ہے۔ مؤلف نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک جگہ یوں گرایا ہے، ملاحظہ ہو:

’’اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر وفات نبوی کے وقت پانچ برس کے قریب تھی، اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی نو دس برس کی، اس طرح گو طبقہ کے لحاظ سے بعض نے ان کا شمار صغار صحابہ میں کر لیا ہے، مگر ان کبار صحابہ کے مقابلہ میں ان حضرات کو نہیں رکھا جا سکتا جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ برسہا برس گذار دیئے، اور دین قائم کرنے میں آپ کے زیر تربیت ہر قسم کی ظاہری اور باطنی قربانیاں دیں تا آنکہ بارگاہ الٰہی سے انہیں بشارت مل گئی کہ وہ سب خلاصۂ کائنات اور خیر الامم ہیں۔ (ص: ۳۷)

مؤلف نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو صحابہ کے طبقہ سے نکالنے کی کوشش کی، اور طبقہ کے لحاظ سے بعض نے ان کا شمار صغار صحابہ میں کر لیا ہے، کہہ کر ان کی صحابیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی اور اس کے مقابلہ میں یزید کو کیا کیا برتری دینے کی کوشش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

’’امیر یزید کبار تابعین میں تھے، اپنے محترم والد ماجد کے علاوہ بعض اجلّہ صحابہ سے فیض صحبت اٹھایا، یعنی حضرت دحیہ الکلبی سے جو جلیل القدر صحابی ہونے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر بھی رہے تھے، ان کی حقیقی بہن سیدہ شراف بنت خلیفہ سے آپ نے نکاح کیا تھا وہ امیر یزید کے رشتہ میں ماموں بھی ہوتے ہیں، نیز حضرت ابوالدرداء اور حب رسول اللہ حضرت اسامہ بن زید اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا، حضرت ابوایوب انصاری (ص: ۴۴) اور دوسرے صحابہ اور اپنے والد ماجد سے حدیث کی روایت کی الخ (ص: ۴۵)

پھر مؤلف نے صفحہ ۲۸۶ سے یزید کی تعلیم وتربیت اور جوانی کو نہایت رنگین انداز میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اور ان کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے بدرجہا بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اندازہ لگایئے کہ ان حرکتوں کا کیا مطلب ہے، اور اس سے کس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔

حافظ ابن حجر پر الزام

کتاب کے صفحہ ۴ سے خاص طور سے کردارِ یزید کا عنوان شروع ہوتا ہے، جس میں آخر تک جگہ جگہ علمی خیانتوں کا مظاہرہ کرکے یزید کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ہم اس قسم کی چند خیانتوں کو مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں، مؤلف لکھتے ہیں:

’’تہذیب التہذیب میں امام ابن حجر عسقلانی نے امیر موصوف کا ذکر رواۃ احادیث میں کرتے ہوئے محدث یحییٰ بن عبدالملک بن عتبہ الکوفی المتوفی ۱۸۸ھ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ امیر یزید کو احد الثقات ’’یعنی ثقہ راویان حدیث میں شمار کرتے تھے، مراسیل ابوداؤد میں ان کی مرویات ہیں، (ص:۴۵)

ابن حجر عسقلانی پر پہلا بہتان یہ رکھا کہ انہوں نے ’’یزید کا ذکر رواۃ حدیث میں کیا ہے حالانکہ انہوں نے یزید کو تہذیب التہذیب میں بیان کی وجہ اسی کے تذکرہ میں لکھ دی ہے۔

[ذكرته للتميز بينه وبين النخعي] (۱۱/۳۶۱)

’’میں نے یزید بن معاویہ کا ذکر اس میں اور یزید نخعی میں فرق کرنے کے لئے کیا ہے‘‘۔

ابن حجر نے یزید بن معاویہ سے پہلے یزید بن معاویہ نخعی کوفی عابد کا تذکرہ کیا، جو نہایت متقی اور عابد وزاہد راوی حدیث ہیں، ان کے بعد یزید بن معاویہ کا ذکر کیا ہے، اور اس کے بعض کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دونوں کا نام یزید ہے اور دونوں کی ولدیت معاویہ ہے، مگر دونوں میں فرق ہے، اور فرق کی یہ باتیں ہیں، اس تصریح کے بعد بھی اس کے سر تھوپنا کہ انہوں نے یزید کو احادیث کے راویوں میں شمار کیا ہے، یزید سازی کے سوا کیا ہو سکتا ہے پھر ابن حجر نے اس کے ذکر میں یہ بھی تصریح کردی ہے۔

[وليست له رواية تعتمد] (۱۱/۳۶۱)

’’اور یزید کی کوئی ایسی روایت نہیں ہے، جو قابل اعتماد ہو‘‘۔ [1]

اس تصریح کے بعد اسے رواۃ حدیث میں شمار کرنے کا الزام ابن حجر پر رکھا، پھر بڑی جرأت کے ساتھ یحیی بن عبدالملک کی صفت ’’احد الثقات‘‘ کو یزید پر چسپاں کرنے کی کوشش کی، اور اسے یحیی بن عبدالملک کا قول قرار دے کر حافظ ابن حجر پر اس کے نقل کرنے کا الزام دھرا۔ یہ بھی سراسر جھوٹ ہے کہ مراسیل ابوداؤد میں یزید کی مرویات ہیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابوداؤد میں یزید کی صرف ایک مرسل روایت ہے، جس پر میں نے اپنی کتاب ’’الاستدراک علی الاطراف‘‘ میں تنبیہ کر دی ہے، تہذیب التہذیب کی پوری عبارت یہ ہے۔

[وليست له رواية تعتمد وقال يحيى بن عبد الملك بن اب ابى عتبة احد الثقات ، ثنا نوفل بن ابى عقرب ثقة ، قال كنت عند عمر بن عبد العزيز فذكر رجل يزيد بن معاوية فقال قال امير المومنين يزيد فقال عمر تقول امير المومنين يزيد ، وامر به فضرب عشرين سوطاً ، ذكرته للتمييز بينه وبين النخعى ثم وجدت له رواية فى مراسيل ابى داؤد وقد نبّهت عليها فى الاستدراك على الاطراف] (تہذیب التہذیب (١١/٣٦١))

’’اور یزید کی کوئی قابل اعتماد روایت نہیں ہے، اور یحییٰ بن عبدالملک بن ابی عتبہ جو ایک ثقہ راوی ہیں، انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا نوفل بن ابی عقرب نے جو کہ ثقہ راوی ہیں کہ میں عمر بن عبدالعزیز کے پاس تھا کہ ایک آدمی نے کہا،’’ امیر المومنین یزید نے کہا یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز نے کہا تم امیر المومنین یزید کہتے ہو یہ کہہ کر اس کی سزا کا حکم دیا، چنانچہ اس کو بیس کوڑے مارے گئے، میں نے یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یزید بن معاویہ نخعی کوفی عابد میں اور اس میں فرق ہو جائے پھر میں نے یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کی ایک روایت سنن ابوداؤد کے مراسیل میں پائی ہے، جس پر ’’استدارک علی الاطراف‘‘ میں تنبیہ کر دی ہے‘‘۔

مؤلف نے کس طرح محدثین پر بہتان تراشی کر کے یزید نوازی کرنی چاہی ہے بات تو جب تھی کہ اس حرکت کے بغیر یزید کی فضیلت بیان کرتے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ پر الزامات

آگے چل کر مؤلف کا بیان ہے ’’امیر یزید نے زمانہ طالب علمی ہی سے احادیث نبوی کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اہل علم

میں ان کو بصیرت خاصل حاصل تھی، اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ مورخین نے لکھا ہے جس کو علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ میں یہاں (ص: ۴۵) میں نقل کرتا ہوں:

[وفی روایة ان یزید لما قال له ابوه سلنی حاجتك قال له یزید اعتقنی من النار اعتق الله رقبتك منها ، قال وکیف قال لانی وجدت فی الآثار انه من تقلد الامة ثلاثة ایام حرمه الله علی النار] (البدایه والنهایه :۸/۲۲۷)

”اور روایت ہے کہ یزید سے جب ان کے والد نے کہا جو بات وخواہش تمہاری ہو، مجھ سے کہو، تو یزید نے ان سے کہا مجھے نار دوزخ سے بچا لیجیے، اللہ تعالیٰ آپ کی گردن کو اس سے آزاد رکھے (معاویہ رضی اللہ عنہ) نے پوچھا وہ کیونکر (یزید) نے کہا میں نے احادیث میں پایا ہے کہ جس کو تین دن کے لئے امت کا امر (خلافت) سونپا جائے، اللہ تعالیٰ اس پر نار دوزخ کو حرام فرمائے گا“۔

مؤلف کی کتاب کے صفحہ ۴۵، ۴۶ سے عربی عبارت اور اس کا ترجمہ ہم نے نقل کر دیا ہے جس دلچسپ واقعہ کی طرف مؤلف نے اشارہ کیا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ اسے کچھ تفصیل کے ساتھ نقل کرنا پڑ رہا ہے، اس واقعہ کے نقل کرنے، اور عربی کی پوری عبارت درج کر دینے سے مؤلف کا خانہ کذب وافتراء گر جائے گا۔

اس دلچسپ قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ یزید کو بچپن ہی میں اس کی والدہ میسون نے کنگھی کی، اور اسے سنوارا یہ دیکھ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی دوسری بیوی فاختہ بنت قرظہ کو یزید پر رشک ہوا، اور انہوں نے اس کے بارے میں ایک آدھ جملہ کسا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکے عبداللہ کو جو فاختہ کے بطن سے تھا، بلایا اور کہا کہ تمہاری جو خواہش ہو بیان کرو، میں پوری کروں گا، وہ بیوقوف تھا، اس نے کہا میرے لئے ایک موٹا تازہ کتاب اور ایک موٹا تازہ گدھا خرید دو، اس کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو بلایا اور کہا کہ تمہاری جو حاجت ہو مجھ سے کہو میں پوری کروں گا، یہ سن کر یزید سجدے میں گر گیا، اور سر اٹھا کر بولا، اللہ کا شکر ہے، کہ اس نے امیر المومنین کو اس ارادے تک پہونچا دیا ہے، اور ان کو میرے بارے میں ایسا ارادہ کرا دیا ہے، پھر یزید نے کہا ”حاجتی ان تعقد لی العهد من بعدك وتولینی العام صائفة المسلمین“ میری حاجت یہ ہے کہ آپ اپنے بعد مجھے ولی عہد بنائیں، اور اس سال مسلمانوں کے موسم گرما کی فوج کا امیر بنائیں۔ نیز جب میں واپس آجاؤں تو آپ مجھے حج کی اجازت دیں، اور موسم حج کی امارت میرے سپرد کریں، اور اہل شام میں ہر ایک کے وظیفہ میں دس دینار کا اضافہ میری سفارش سے کریں اور بنی جمح، بنی سہم اور بنی

عدی کے یتیموں کے لئے وظیفہ مقرر کریں‘‘۔ اس کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید میں مزید گفتگو ہوئی آخر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

[قد فعلت ذلك كله و قبل وجهه]

’’میں نے یہ سب کردیا، یہ کہہ کرانہوں نے اس کے چہرے کو بوسا دیا‘‘۔

پھر اپنی بیوی فاختہ بنت قرظہ سے کہا کہ تو نے اپنے بیٹے عبداللہ کے مقابلہ میں یزید کو کیسا پایا۔

اس دلچسپ واقعہ کے ختم ہوجانے پر لکھا ہے کہ:

[وفي رواية ان يزيد لما قال له ابوه سلني حاجتك قال يزيد الخ]

مصنف نے پورا واقعہ حذف کر کے اس آخری ٹکڑے کو لیا ہے، جسے صرف ایک روایت کے بموجب صاحب البدایہ والنہایہ نے نقل کردیا ہے، پھر مؤلف نے خیانت کرتے ہوئے اس عبارت کا آخری ٹکڑا حسب عادت حذف کردیا ہے۔ اور ادھوری عبارت نقل کردی ہے، حالانکہ پوری عبارت یوں ہے۔

[حرمه الله على النار فاعهد الى بالامر من بعدك ففعل] (البدايه والنهايه :۸/۲۲۷)

یعنی یزید نے حدیث کا حوالہ دینے کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ اپنے بعد مجھے ولی عہد بنادیجئے تو انہوں نے ایسا کردیا۔

اس قصے سے یزید کی حدیث دانی اور پرہیزگاری ثابت کرنے کے لئے مؤلف نے جو ناقص عبارت نقل کی، اس کے پورا ہوجانے سے مطلب ہی بدل گیا ہے۔ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر الزام آتا ہے۔ نیز مؤلف نے آگے چل کر صفحہ ۱۱۳ پر یزید کی حرارت دینیہ وخدمات ملیّہ کے ماتحت اس قصہ کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے:

[تولینی العام صائفة المسلمين]

’’اس سال کی عسکری مہم مسلمانان پر مجھے تعینات کیا جائے‘‘۔

حالانکہ اس عبارت کو بھی نقل کرنے کی ضرورت نہ تھی، اور اس کہانی کے ان نامکمل ٹکڑوں کے بغیر کام چل سکتا تھا، مؤلف نے لکھا ہے:

”علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کے (یزید) بارے میں اسی قسم کے الفاظ تحریر کئے ہیں۔ لکھتے ہیں: [1]

[وقد كان فيه خصال محمودة من الكرم والحلم والفصاحة والشعر والشجاعة وحسن الرأى فى الملك وكان ذا جمال حسن المعاشرة]

”اور یزید کی ذات میں قابل ستائش صفات رحم و کرم، فصاحت و شعر گوئی اور شجاعت و بہادری کی تھیں، نیز معاملات حکومت میں عمدہ رائے رکھتے تھے اور وہ خوبصورت اور خوش سیرت تھے“۔

صفحہ ۴۹ سے مؤلف کی بیان کردہ عربی عبارت اور ان کا ہی کیا ترجمہ ختم ہوا علامہ ابن کثیر کی اس عبارت میں اپنی عام عبارات کے مطابق مؤلف نے تقصیر کی ہے پوری عبارت یہ ہے:

[------ حسن العاشرة وكان فيه ايضاً اقبال على الشهوات وترك بعض الصلوٰت فى بعض الاوقات واماتتها فى غالب الاوقات] (البدايه والنهايه :۸/۲۲)

”------ یزید خوش سیرت تھا، نیز اس کے اندر شہوتوں پر توجہ دینا، اور بعض نمازوں کا چھوڑنا بعض اوقات میں اور اکثر اوقات میں نمازوں کا قضا کر دینا بھی تھا“۔

مؤلف نے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے پورے جملہ کی یہ آخری عبارت نقل نہیں کی اور یہ باور کرانا چاہا کہ انہوں نے یزید کے نیک ہونے کی شہادت دی ہے۔

حالانکہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی عبارت سے متصل اپنے منشاء کی تائید میں سیدنا ابوسعید خدریؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے:

[سمعت رسول الله ﷺ يقول يكون خلف من بعدى ستين سنة اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيّا ثم يكون خلف يقروؤن القران لا يتجاوز تراقيهم ويقرأ القرآن ثلثة مومن و منافق و فاجر] (البدايه والنهايه :۲۳/۸)

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ساٹھ سال کے بعد سے کچھ لوگ نماز کو ضائع کریں گے، اور خواہشوں کے پیچھے پڑیں گے، پس گمراہی میں پڑ جائینگے پھر اس کے بعد کے کچھ لوگ قرآن پڑھیں گے جو ان کی پسلیوں سے آگے نہیں بڑھے گا، اور قرآن کو تین قسم کے لوگ پڑھتے ہیں مومن اور منافق اور بدکار“۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس حدیث کو بیان کرنے کا مقصد آخری عبارت کی تصدیق وتوثیق ہے، اور یہ ان کی غایت دیانتداری ہے کہ وہ یزید کے بارے میں محامد اور معائب دونوں بیان کرتے ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، وہ اس بارے میں بڑے ہی محتاط ہیں، اور یزید سے بہتان دور کرنے کی راہ سوچتے ہیں۔

مؤلف نے صفحہ ۲۹۶ پر علامہ ابن کثیر کے حوالے سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت کا ترجمہ بیان کیا ہے، جس میں آپ نے یزید کو اچھی باتوں کی نصیحت فرمائی ہے، ترجمہ کا آغاز یوں ہے:

''اے یزید! اللہ سے ہر وقت ڈرتے رہنا، یہ امر (خلافت) تمہیں تفویض ہوا ہے، اور تم اب اس کام کے با اختیار ہو، جس کا میں بھی تھا، تم نے اگر اس کو خوش اسلوبی سے انجام دیا مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی، اور اگر اس کے خلاف کیا تو دکھ ہوگا۔ الخ''۔

اس کے بعد تقریباً دو صفحے میں وصیت کا ترجمہ دیا گیا ہے، اوپر کے اقتباس کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ یوں ہے:

[يا يزيد اتق الله فقد وطات لك هذا الامر ووليت من ذلك ما وليت فان يك خيراً اسعد به وان كان غير ذلك شقيت به] (البدايه والنهايه : ۸/۲۲۸)

''اے یزید! تم اللہ سے ڈرو کیونکہ میں نے تمہارے لئے اس امر یعنی خلافت کو ہموار کر دیا ہے، اور میں جس چیز کا والی تھا، تمہیں بھی اس کا والی بنا دیا ہے، اگر میرا یہ کام بہتر ہوگا تو اس سے خوش قسمت ثابت ہوں گا، اور اگر یہ کام اس کے علاوہ ہوا تو پھر میں اس کی وجہ سے ناکام و بدنصیب ثابت ہوں گا''۔

مؤلف نے ترجمہ ایسا کیا ہے کہ اس سے یہ پتہ نہ چلے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ولی عہد بنایا، اور خلافت کے معاملے کو اس کے لئے ہموار کیا، اس بات کے ظاہر کرنے میں کون سا ڈر ہے جبکہ خود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اسے ظاہر فرماتے ہیں، اور مؤلف نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ یہ ثابت کیا ہے کہ یزید کی بیعت عام تھی، اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے برضا ورغبت بیعت کی، پھر یہ جو اوپر عبارت اور ترجمہ دیا گیا ہے اس سے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حسن نیت اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے، اور ان کے یزید کو ولی عہد بنانے میں ملّی اور دینی جذبہ کار فرما تھا، اس کی ترجمانی ہو رہی ہے، اس عبارت کو پیش کر کے ہم اس سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی پاک نیتی اور دیانتداری کو ثابت کر سکتے ہیں۔

کتاب فضل یزید کی حقیقت

مؤلف نے ''کتاب فضل یزید'' کے بیان میں ابن کثیر کے حوالے سے شیخ عبد اللہ عبد المغیث بن زبیر عربی حنبلی رحمہ اللہ کی اس کتاب کا ذکر یوں کیا ہے:

''انہوں نے امیر یزید کے حسن سیرت اور اوصاف پر مفصل تصنیف کی۔

[وله مصنف فی فضل یزید بن معاویة اتی فیه بالغرائب والعجائب] (البدایه والنهایه : ۱۲/۳۲۸)

''اور ان کی (شیخ عبد المغیث کی) تصنیف سے فضل یزید بن معاویہ پر ایک کتاب ہے، جس میں بہت سے عجیب و غریب حالات بیان کئے گئے ہیں''۔

مؤلف کی یہ عبارت (ص:۵۶) سے مع عربی اور ان ہی کے ترجمہ پر ختم ہوئی اس عبارت کے نقل کرنے اور اس کا ترجمہ کرنے میں حسب عادت انہوں نے اپنے دونوں کام کئے، علامہ ابن کثیر کی عبارت ادھوری نقل کی، اور ترجمہ میں غلطی کی، پوری عبارت اور اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

[وله مصنف فی فضل یزید بن معاویة اتی بالغرائب والعجائب وقد ردّ علیه ابو الفرج ابن جوزیؒ فاجاد واصاب] (البدایه والنهایه : ۱۲/۲۳۸)

''اور ان کی (شیخ عبد المغیث کی) یزید بن معاویہ کی فضیلت کے بارے میں ایک تصنیف ہے، جس میں انہوں نے انجانی اور تعجب خیز باتیں بیان کی ہیں، اور علامہ ابو الفرج ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کا ردّ لکھا ہے، اور اچھا اور درست و صحیح کام کیا ہے''۔

اولاً مؤلف نے ''الغرائب والعجائب'' کا ترجمہ بہت سے عجیب وغریب حالات'' کر کے قارئین کو دھوکہ دینا چاہا ہے کہ اس میں بہت اچھی اچھی باتیں اور کام کی باتیں درج ہیں، حالانکہ ''غرائب اور عجائب'' کا اطلاق عربی قاعدہ میں ایسی چیزوں اور باتوں پر ہوتا ہے جو غیر معروف اور غیر مشہور ہوں، اور ان کو سن کر اس لئے تعجب ہو کہ وہ بالکل نئی ہوتی ہیں دوسرے مؤلف نے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی آخری عبارت حذف کر کے اس عبارت کی روح ختم کرنا چاہی اور علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کتاب کے اوپر جو رائے ظاہر کی ہے اسے چھپا کر شیخ عبد المغیث کی واہی تباہی والی کتاب کو

اہمیت دینی چاہی ہے، مؤلف نے (ص:٧٥٦) ہی پر ’’کتاب فضل یزید‘‘ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس کی شہرت ہوئی تو خلیفہ وقت الناصر شیخ کی خدمت میں تبدیلی ہیئت کر کے آئے، شیخ نے پہچان لیا، مگر اس کا اظہار نہ کیا، خلیفہ الناصر نے امیر یزید کے بارے میں شیخ سے سوال کیا، اور شیخ نے جواب دیا:

فساله الخليفة عن يزيد ايلعن ام لا فقال لا اسوغ لعنه لانى لو فتحت هذا الباب ، لافضى الناس الى لعن خليفتنا ، فقال الخليفة ولم ، قال لانه يفعل اشياء منكرة كثيرة منها كذا و كذا ثم شرع ثم شرع يعدد على الخليفة افعاله القبيحة وما يقع منه من المنكر لينزجر منها فتركه الخليفة و خرج من عنده اثر كلامه وانتفع به]

’’خلیفہ نے (شیخ عبدالمغیث سے) سوال کیا کہ یزید پر لعن کی جائے یا نہیں، انہوں نے جواب دیا کہ لعن کرنا ہرگز جائز نہیں اور لعن کا دروازہ کھول دیا جائے تو لوگ ہمارے موجودہ خلیفہ پر لعن کرنے لگ جائیں گے، خلیفہ نے پوچھا وہ کیوں شیخ نے کہا کہ وہ بہت سی منکرات پر عمل پیرا ہوئے ہیں جن میں سے یہ یہ امور ہیں، انہوں نے خلیفہ کے برے افعال گنانے شروع کئے نیز جو منکرات سرزد ہوئے تھے، خلیفہ نے گفتگو ترک کر دی، اور ان کے پاس سے اٹھ آئے، لیکن ان کے کلام کا اثر ان کے دل پر ہوا، اور اس سے ان کو نفع ہوا‘‘۔

(ص:٥١٩) کی عربی عبارت اور اس کا ترجمہ مؤلف کے مطابق ختم ہوا، معلوم نہیں اس پوری عبارت میں یزید پر لعن کرنے نہ کرنے کا کیا تعلق ہے، اس سے تو شیخ عبدالمغیث کی حق گوئی اور خلیفہ کے سامنے اس کے معائب و منکرات کی نشان دہی کا پتہ چلتا ہے، جو ہمارے علماء کی امتیازی شان رہی ہے، ساتھ ہی اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر افعال قبیحہ اور منکرات کے سرزد ہونے کی وجہ سے یزید پر لعن جائز ہو جائے تو پھر خلیفہ وقت پر اس کا جواز نکل آئے گا، کیونکہ یہ بھی فلاں فلاں قبیح افعال اور غیر شرعی کام کرتا ہے، اس میں صرف یزید مستحق ملامت و لعنت کیوں ٹھہرے، خلیفہ وقت بھی اس کا سزاوار ہوگا، اس واقعہ سے تو یزید کے افعال قبیحہ اور منکرات کا پتہ چلتا ہے نہ کہ فضیلت و بزرگی ثابت ہوتی ہے، معلوم نہیں مؤلف طرفداری کے کس عالم میں اس واقعہ کو لکھ گئے، نیز مؤلف نے شیخ عبدالمغیث کے ’’ قول لا اسوغ لعنه لانى لو فتحت هذا الباب ‘‘ کا ترجمہ غلط کیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ’’میں اس پر لعن کی اجازت نہیں دیتا ہوں، کیونکہ اگر میں لعن کا یہ دروازہ کھول دیتا ہوں تو ـــ‘‘ نہیں، انہوں نے جواب دیا کہ لعن کرنا ہرگز جائز نہیں اور لعن کا دروازہ کھول دیا جائے تو لوگ ہمارے موجود خلیفہ پر لعن کرنے لگ جائیں گے، خلیفہ نے پوچھا وہ کیوں

شیخ نے کہا کہ وہ بہت سی منکرات پر عمل پیرا ہوئے ہیں جن میں سے یہ یہ امور ہیں، انہوں نے خلیفہ کے برے افعال گنانے شروع کئے نیز جو منکرات سرزد ہوئے تھے، خلیفہ نے گفتگو ترک کردی، اور ان کے پاس سے اٹھ آئے، لیکن ان کے کلام کا اثر ان کے دل پر ہوا، اور اس سے ان کو نفع ہوا''۔

(ص:۵۱۹) کی عربی عبارت اور اس کا ترجمہ مؤلف کے مطابق ختم ہوا، معلوم نہیں اس پوری عبارت سے یزید پر لعن نہ کرنے کا کیا تعلق ہے، اس سے تو شیخ عبدالمغیث کی حق گوئی اور خلیفہ کے سامنے اس کے معائب و منکرات کی نشان دہی کا پتہ چلتا ہے، جو ہمارے علماء کی امتیازی شان رہی ہے، ساتھ ہی اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر افعال قبیحہ اور منکرات کے سرزد ہونے کی وجہ سے یزید پر لعن جائز ہو جائے تو پھر خلیفہ وقت پر اس کا جواز نکل آئے گا، کیونکہ یہ بھی فلاں فلاں قبیح افعال غیر شرعی کام کرتا ہے، اس میں صرف یزید مستحق ملامت و لعنت کیوں ٹھہرے، خلیفہ وقت بھی اس کا سزاوار ہوگا، اس واقعہ سے تو یزید کے افعال قبیحہ اور منکرات کا پتہ چلتا ہے نہ کہ فضیلت و بزرگی ثابت ہوتی ہے، معلوم نہیں مؤلف طرفداری کے کس عالم میں اس واقعہ کو لکھ گئے، نیز مؤلف نے شیخ عبدالمغیث کے'' قول لا اسوغ لعنه لانی لو فتحت هذا الباب'' کا ترجمہ غلط کیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''میں اس پر لعن کی اجازت نہیں دیتا ہوں، کیونکہ اگر میں لعن کا یہ دروازہ کھول دیتا ہوں تو۔۔۔۔۔'' مؤلف نے اس مقولہ کا عام حکم بنا کر یہ ترجمہ فرمادیا ہے، ''لعن کرنا ہرگز جائز نہیں'' اور ''لعن کا دروازہ کھول دیا جائے تو، ترجمہ میں ذرا ذرا سی تبدیلی کر کے بات کہیں سے کہیں لے جانے میں مؤلف بہت ماہر ہیں۔

یزید کی ولی عہدی کی داستان

مؤلف نے لکھا ہے:

''الغرض امیر یزید کا ولی عہد اور اس کے بعد خلیفہ منتخب ہونا پوری امت کی رضامندی سے ہوا تھا، یہ رضامندی مصلحت ملیّہ کے تقاضہ کی بنا پر تھی، نہ کسی خوف کے تحت اور نہ لالچ کی وجہ سے، ان کا انتخاب کسی اندرونی اختلاف کا ثمرہ اور وقتی حادثہ نہ تھا، بلکہ ان کے بہترین زمانہ میں جب جذبات میں کوئی ہیجان نہ تھا، اجلّہ صحابہ کرام کی تحریک و تائید سے ہوا، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفقا اور آپ کے آل البیت اس پر مستقیم رہے''۔ (ص:۴۰)

اس عبارت میں یزید کی بیعت و خلافت کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اور جو شاندار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، وہ

ایک طرف اگر یزید کی شان کو دوبالا کرتے ہیں تو دوسری طرف سیدنا علی ؓ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، اور ایک ایک لفظ میں سیدنا علی ؓ پر چوٹ اور تعریض ہے۔

یزید کی بیعت ولی عہدی کے ہمہ گیر ہونے کو مؤلف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

’’عالم اسلام کے ہر ہر علاقہ میں لوگوں نے بلا کسی اختلاف کے بیعت کی تھی، اور ہر جگہ کے وفود توکید بیعت کے لئے امیر یزید کے پاس حاضر ہوئے تھے، فاتسقت البیعة لیزید فی سائر البلاد ، ووفدت الوفود من سائر الاقالیم الی یزید (البدایہ والنہایہ:۸/۸۰) امیر یزید کی ولی عہدی کی بیعت سے پہلے کبھی اس اہتمام سے بیعت نہیں لی گئی تھی، کہ مملکت اسلامی کے گوشہ گوشہ سے بیعت کے لئے وفود آئے ہوں، اور ہر علاقہ سے لوگوں نے بطیب خاطر اس طرح ایسے قریشی نوجوان کی بیعت کی ہو، جو اپنی صلاحیتوں اور خدمات عالیہ کے کارہائے نمایں کی وجہ سے ملت کا محبوب تھا‘‘۔ (ص:۴۰)

یزید کی ولی عہدی کے جواز کا مقام بہت ہی کٹھن تھا، اس کے بعد پھر تمام منزل آسان ہوجاتی ہے، اسی لئے مؤلف نے یزید کی منقبت میں نہایت موٹے موٹے الفاظ استعمال کرکے اسے بیعت کے اعتبار سے حضرات خلفائے راشدین ؓ سے بھی بلند مرتبہ قرار دیدیا ہے، اور یزید کی صلاحیتوں اور ’’جذبات ملی کے کارہائے نمایاں‘‘ کی بنیاد پر اس کی محبوبیت کا قصر قائم کرکے پورے عالم سے اس کی زیارت کرائی ہے، اور اپنی عادت کے مطابق علامہ ابن کثیر ؒ کی عبارت مین خیانت کرکے دھوکہ دیا ہے، ملاحظہ ہو:

علامہ ابن کثیر ؒ بیان کرتے ہیں کہ یزید کی بیعت کے لئے وفود بلائے گئے، اور ان کے سامنے حضرت معاویہ ؓ نے تقریر کی، اس کے بعد یزید کی بیعت ہونے لگی، اور آئے ہوئے لوگ دھمکی کی وجہ سے لب کشائی نہ کرسکے، اس طرح یزید کی بیعت چل پڑی، پوری عبارت یہ ہے:

[ثم خطب معاوية ، وهؤلاء حضور تحت منبره و بايع الناس ليزيد وهم قعود ، ولم يوافقوا ولم يظهر واخلافا لما تهددهم وتوعدم فاتسقت البيعة ليزيد فى سار البلاد] (البدايه والنهايه : ٨/٨٠)

’’پھر معاویہ ؓ نے خطبہ دیا، یہ لوگ منبر کے نیچے موجود تھے، عام لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی، اور یہ

لوگ بیٹھے رہے، نہ موافقت کی، نہ مخالفت، کیونکہ ان کو ڈرایا دھمکایا تھا، پس یزید کی ولی عہدی کی بیعت تمام شہروں میں چل پڑی"۔

اصل اور پوری عبارت سامنے آجانے کے بعد فیصلہ آسان ہے، کہ یزید کی ولی عہدی کی بیعت کس حال میں ہوئی، اور مؤلف نے اپنے خیال کو ثابت کرنے کے لئے کیا حرکت کی ہے، مؤلف خلافت معاویہؓ و یزید کیا اس واقعہ کا انکار کرکے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک ہزار درہم بطور نذر بھیجے گئے، جسے انہوں نے قبول کرلیا، اس کے بعد یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے بیعت کا تذکرہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "میں اپنے دین کو دنیا کے بدلے فروخت نہیں کروں گا، معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا ایک ہزار درہم پر میرا دین خریدنے کا قصد کیا ہے؟ یہ کہہ کر رقم واپس کردی، اور یزید کی بیعت سے انکار کردیا، اور کیا صحاح ستّہ میں مذکور اس واقعہ سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ مروان نے مدینہ منورہ کے لوگوں کو جمع کرکے یزید کی بیعت کا خط سنایا، تو عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے اٹھ کر کہا کہ تم لوگ خلافت کو ہرقلی حکومت بنانا چاہتے ہو کہ جب ایک ہرقل مرجائے تو اس کی جگہ دوسرا ہرقل قائم ہو، پھر سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی تصدیق وتائید کی، اور جلسہ بیعت درہم برہم ہوگیا، اور اس کے بعد یزید کی تعریف ومنقبت میں تمام بلاد وامصار میں خطوط لکھے لگنے اور اس کی اہلیت اور بزرگی کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اس موقع پر بیعت کرکے یزید کی ولی عہدی کو تسلیم کرلینے کے لئے کیا یزید کا ایک شعر پیش کرکے اس کا اپنے ذوق کے مطابق بیان کردینا کافی ہے، جیسا کہ مؤلف نے ص ۷۵ پر کیا ہے۔

مؤلف نے ص ۳۸ اور ص ۳۹ پر علامہ ابن خلدون کے شہرۂ آفاق مقدمہ کی ایک طویل عبارت کا ترجمہ درج کیا ہے، اور دیگر خیانتوں کے ساتھ ایک زبردست خیانت یہ کی ہے، کہ اس بحث کا سب سے آخری پیرا اپنی عادت کے مطابق حذف کردیا ہے، اور اس عبارت کا ترجمہ نہیں کیا ہے، وہ عبارت یہ ہے۔

[وفرار عبد الله بن عمر من ذلك انما هو محمول على تورعه من الدخول فى شيئ من الامور مباحاً كان اور محظورا ، كما هو معروف عنه الخ] (مقدمه ص :٧٦)

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے: "اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یزید کی ولی عہدی کی بیعت سے بھاگ جانا، ان کی شدت احتیاط کی وجہ سے تھا، کسی بھی معاملہ میں خواہ وہ جائز یا ناجائز جیسا کہ ان کے بارے میں مشہور ہے"۔

اگر مؤلف اس جملہ کو نقل کرتے تو ان کا وہ دعویٰ باطل ہوجاتا جو کتاب میں جگہ جگہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے یزید کے طرفدار ہونے کے بارے میں کیا گیا ہے، اس لئے انہوں نے اسے حذف کر کے علامہ ابن خلدون کی عبارت میں خیانت کی، اور بتانا چاہا کہ وہ بھی میری ہی طرح حق پوش وجانبدار ہیں۔

ولی عہد بنانے کی وجہ

مؤلف نے یزید کے ولی عہد اور پھر خلیفہ بنانے کی وجہ نہایت والہانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے یزید کی صلاحیت و قابلیت اور اس کی دور اندیشی و دیانتداری وغیرہ کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا، مگر مؤرخین و وقائع نگار حتیٰ کہ علامہ ابن خلدون یزید کے بارے میں ان باتوں کے ہرگز قائل نہیں ہیں، اور نہ اسے اس اعتبار سے امامت وخلافت کا اہل مانتے ہیں، بلکہ سیدنا معاویہؓ کے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد اور اپنا قائم مقام بنانے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں ملاحظہ ہو، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

[والذی دعا معاوية لايثار ابنه يزيد بالعهد دون من سواه انما هو مراعاة المصلحة فی اجتماع الناس واتفاق اهوائهم باتفاق اهل الحل والعقد عليه حينئذ من بنی امية اذ بنو امية يومئذ لا يرضون سواهم وهم عصابة قريش واهل الملة اجمع ، واهل الغلب منهم فآثره بذلك دون غيره ممن يظن انه اولی بها وعدل الفاضل الی المفضول حرصًا علی الاتفاق واجتماع الاهواء الذی شانه اهم عند الشارع] (مقدمه ص ۱۷۵،۱۷۶)

’’اور جس بات نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی دوسرے کو نہیں بلکہ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کی دعوت دی، وہ صرف اس مصلحت کی رعایت تھی کہ اس وقت بنوامیہ کے اہل حل وعقد کے یزید پر اتفاق کرنے سے لوگوں کا اجتماع اور ان کے خیالات کا اتفاق ہوجائے گا، کیونکہ اس وقت بنوامیہ اپنے ان اہل الحل والعقد کے علاوہ کسی کے ماننے پر راضی نہیں تھے، اور بنوامیہ ہی قریش اور پورے اہل ملت کے سرگروہ تھے، اور اہل غلبہ ان میں سے تھے، اسی وجہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو دوسرے پر ترجیح دی، جس کے متعلق گمان تھا کہ وہ ولایت وخلافت کے زیادہ موزوں وبہتر ہے، اور انہوں نے فاضل وبہتر سے ہٹ کر مفضول ونامناسب کو ولی عہد بنایا، وہ بھی اس خیال سے کہ اتفاق باقی رہے، اور لوگوں کے خیالات مجتمع رہیں، اس لئے کہ اتفاق واجتماع شارع کے نزدیک بہت اہم چیز ہے‘‘۔

نیز سیدنا معاویہ ؓ کے حسن نیت اور حرص علی الاجتماع کو یزید کے ولی عہد بنانے کی وجہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

[ما حدث فی یزید من الفسق ایام خلافته فایاك ان تظن معاویة رضی الله عنه انه علم بذلك فانه ، اعدل من ذلك وافضل بل كان یعذله ایام حیاته فی سماع الغناء عنه وهو اقل ذلك] (مقدمه ابن خلدون ١٧٦-١٧٧)

”یزید کے اندر اس کی خلافت کے زمانہ میں جو فسق وفجور پیدا ہوا، خبردار تم ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ معاویہ ؓ اسے جانتے تھے، کیونکہ وہ اس سے اعلیٰ وافضل ہیں، بلکہ وہ تو اپنی زندگی میں یزید کو گانا سننے پر ملامت کرتے تھے، اور روکتے تھے، حالانکہ غناء فسق سے کم درجہ کا گناہ ہے“۔

ان تصریحات سے سیدنا معاویہ ؓ کے اجتہاد ونیت اور یزید کے حالات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے، اور یہ سوال حل ہوجاتا ہے کہ سیدنا معاویہ ؓ نے اپنے بیٹے یزید کو کیوں اپنی زندگی میں ولی عہد بنایا، اور خلافت کے امر کو مسلمانوں کے فیصلے پر کیوں نہیں چھوڑ دیا۔

یزید کی امارت وخلافت کس معنی میں تھی؟

یزید کی امارت وخلافت نہ علیٰ منہاج النبوۃ تھی اور نہ خلافت راشدہ تھی، بلکہ اس کی حیثیت ایک حکومت وسلطنت کی تھی جو غلبہ واقتدار کے بعد ہوجاتی ہے، اور چونکہ شرعاً دینی امور کے نفوذ اور واجب العمل ہونے میں حاکم وسلطان کے نیک وبد ہونے کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ جس طرح نیک امیر کا حکم جہاد وقصاص، عزل ونصب میں مانا جائے گا، اسی طرح بدکار امیر وحاکم کا حکم ان میں نافذ ہوگا، اس لئے یزید کے اعمالِ قبیحہ کے ساتھ ساتھ اس نے جو شرعی احکام جاری کئے ان پر عمل درآمد کیا گیا، اور وہ صحیح تھے۔

اس مسئلہ میں ہم امام ابن تیمیہ ؒ کی صاف وصائب رائے کو پیش کرتے ہیں اور یہی اہل حق کا مسلک وموقف ہے۔

یزید اور اس کی امارت وخلافت کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

[لم نعتقد انه من الخلفاء الراشدین كما قاله بعض الجهلة من الاكراد وكما قیل هو نبی ، فهولاء نظرآء من ادعی نبوة علی او الهیته] (المنتقیٰ ص : ٢٧٩)

’’ہم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ یزید خلفائے راشدین میں سے ہے، جیسا کہ بعض جاہل کردوں نے کہا، اور جیسا کہ کہا گیا ہے، کہ یزید نبی ہے ایسا کہنے والے اس شخص کے مانند ہیں جس نے سیدنا علی ؓ کی نبوت یا ان کی الوہیت کا دعویٰ کیا ‘‘۔

امام ابن تیمیہ ؒ کا یہ بیان بالکل واضح ہے، اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے، اس کے آگے یزید کی امارت کی حیثیت یوں بیان فرماتے ہیں:

[ونحن نقول خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم صار ملكاً كما ورد فى الحديث وان عنيت باعتقاد امامة يزيد انه كان ملك وقته و صاحب السيف كامثاله من المروانية والعباسية فهذا متيقن ، و حكم يزيد على جوزة الاسلام سوى مكة فانه غلب عليها ابن الزبير وامتنع عن بيعة يزيد ، ولم يدع الى نفسه حتى بلغه موت يزيد (ص : ۱۸۱) فكون الواحد من هؤلاء اماما بمعنى انه كان له سلطان ومعه السيف يولى ويعزل ويعطى ويهرم ويحكم و ينفذ و يقيم الحدود ويجاهد الكفار ويقسم الاموال ، امر مشهور متواتر لا يمكن جحده و هذا مع كونه اماما و خليفة وسلطاناً كما ان امام الصلوٰة وهو الذى يصلى بالناس فاذا راينا رجلا يصلى بالناس فيه كان القول بانه امام امرا مشهودا محسوسا لا تمكن المكابرة فيه اما كونه برا او فاجرا ، مطيعا او عاصياً فذاك امر آخر ، فاهل السنة اذا اعتقدوا امامة الواحد من هولاء يزيد او عبد الملك او المنصور اور غيرهم كان بهذا الاعتبار] (المنتقیٰ ص : ۱۸۱-۱۸۴)

’’اور ہم کہتے ہیں کہ خلافت نبوۃ تیس سال تک ہے پھر ملوکیت ہوگئی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، اور اگر تم یزید کی امامت وخلافت کے اعتقاد سے یہ مراد لیتے ہو کہ وہ اپنے وقت کا ملک (بادشاہ) اور صاحب سیف تھا، جیسے مروانی اور عباسی حکمران تو یہ بات یقینی ہے، اور یزید نے سوائے مکہ کے پورے عالم اسلام پر حکومت کی، البتہ مکہ پر ابن زبیر رضی اللہ عنہما غالب رہے، اور یزید کی بیعت سے رکے رہے اور اپنی طرف لوگوں کو دعوت نہ دی یہاں تک کہ ان کو یزید کی موت کی خبر پہونچی، (پس یزید اور مروانی وعباسی حکمرانوں میں سے) کسی کا امام ہونا اس معنی میں ہے کہ اس کے لئے سلطنت تھی اور اس کے ساتھ تلوار تھی، وہ والی بناتا تھا، اور معزول کرتا تھا، اور عطیہ دیتا تھا اور محروم کرتا تھا، اور حکم دیتا تھا اور اسے نافذ

کرتا تھا، اور حدود قائم کرتا تھا، اور کفار سے جہاد کرتا تھا، اور اموال تقسیم کرتا تھا، مشہور و متواتر بات ہے، اس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے اور یہی مطلب ہے یزید کے امام و خلیفہ و سلطان ہونے کا، جس طرح نماز کا امام وہ شخص ہے جو لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے، پس جب ہم کسی کو دیکھیں گے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہے تو یہ کہنا کہ وہ امام ہے، دیکھی جانی ہوئی بات ہوگی، اس میں مکابرہ و انکار ممکن نہیں ہوگا، اور اس کا نیک و بد ہونا مطیع یا عاصی ہونا یہ ایک دوسری بات ہے، اہل سنت جب یزید، یا عبدالملک یا منصور وغیرھم میں سے کسی کی امامت و خلافت کا اعتقاد رکھتے ہیں تو ان کا یہ اعتقاد اسی اعتبار سے اور اس معنیٰ میں ہوتا ہے''۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس صاف و صریح بیان کے باوجود مؤلف اپنی عادت کے مطابق اپنی کتاب ص: ۲۲۹ اور ص: ۲۳۰ پر علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے اسی عبارت کے درمیان سے ایک ٹکڑا لے لیا، اور آگے پیچھے حذف کر کے اپنے مطلب کے مطابق بات بنانی چاہی ہے، اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یزید کی خلافت و امارت بھی ایسی ہی تھی جیسے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت تھی حالانکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یزید کی خلافت و امارت اس معنیٰ میں ہے کہ وہ صاحب اقتدار بن گیا تھا، اور عزل و نصب وغیرہ اس کے اختیار میں تھا جیسے سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما یا جیسے قیصر و کسریٰ صاحب اقتدار حکمران تھے، مگر اس کی امارت و خلافت راشدہ نہیں تھی، بلکہ وہ تو تیس سال کے بعد ختم ہوگئی، اور خلافت پر انارکی اور بادشاہت کا قبضہ ہوگیا۔

تین المناک واقعات واقعہ کربلا عراق، واقعہ حرّہ مدینہ منورہ اور محاصرہ مکہ مکرمہ

جب کوئی نئی حکومت و سلطنت قائم ہوتی ہے تو ابتداء میں اسے طرح طرح کے حالات و واقعات سے گذرنا پڑتا ہے، اور اس کے قیام و استحکام کے سلسلے میں وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو اس کے بانیوں کے بس میں ہوتا ہے، اس دور میں زمانہ جنگ کی طرح اخلاق، قوانین، اور نتائج سے آنکھ بند کر کے صرف ایک ہی کام ہوتا ہے، یعنی ہر ممکن طریقہ سے نئی دولت کا قیام و استحکام۔

''خلافت راشدہ کے بعد خلافت اموی کا قیام بھی اسی اصول کے مطابق ہوا اور اس کے قائم کرنے والوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک نئی حکومت کے قیام کے لئے کرنا چاہیے، یزید، مروان، عبیداللہ بن زیاد، اور عمر بن سعد وغیرہ نے خلافت راشدہ کی بنیاد پر (ملک عضوض) کو اتوار و محکم کرنے کے لیے ان تمام ناسازگار حالات کا جم کر مقابلہ کیا جو خلافت راشدہ

کے اثرات سے تھے، اورنئی حکومت کے قیام میں آڑے آرہے تھے، نیز انہوں نے ایسے حالات پیدا کرنے کی ہرممکن کوشش کی جو ایک نئی دولت کو پروان چڑھا سکیں، چونکہ اس سلسلہ میں نسلی عصبیت اور خاندانی طاقت وشوکت کا عنصر غالب تھا، اس لئے تمام کاموں میں ہر طرف سے آنکھ بند کر کے صرف غلبہ واستیلاء ہی مطمح نظر رہا، اوراس میں دین و اخلاق اور عقیدہ وعمل کی بلندیوں کو نظر انداز کر دیا گیا"۔

ظاہر ہے کہ جس دولت کے قیام کے لئے یہ نظریہ کام کرتا ہو، اس کے نزدیک ہر طاقت خواہ وہ اپنے کیف وکم کے اعتبار سے کتنی ہی مقدس ہو، اور اپنے اصول اور مقصد کے لحاظ سے کتنی ہی بلند ہو، ناقابل معافی مجرم ہوگی، اوراس کا فرو کرنا ضروری ہوگا، چنانچہ دولت اموی کے بانیوں نے ایسے تمام حالات کا مقابلہ کر کے ان کا خاتمہ کیا، جو خواہ کسی نام پر تھے، مگر ان کے مقصد کے خلاف تھے۔

خلافت اموی کے پہلے حکمران یزید کے دور (تین سال نو ماہ) میں اس قسم کے تین واقعات رونما ہوئے، جن میں اس حکومت کو کامیابی ہوئی، اوراس کے مقابل ناکام ہوئے، پہلا واقعہ حادثہ کربلا کا ہے جو یزید کے تخت نشین ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد پیش آیا، اور دو واقعات اس کی زندگی کے آخری دور کے ہیں، ایک واقعہ حرّہ مدینہ منورہ اور دوسرا محاصرہ مکہ مکرمہ، یہ تینوں حادثے دولت اموی کے ابتداء میں نہایت سنگین قسم کے واقع ہوئے، مگر چونکہ واقعہ کربلا کو ایک فرقہ نے اپنی دعوت کا محور بنایا، اور اسے خوب خوب شہرت دی، اس لئے وہ اتنا مشہور ہوا کہ بعد کے دونوں واقعات اس کے مقابلہ میں زیادہ مشہور نہ ہوسکے واقعہ کربلا اس شہرت میں افسانوی رنگ اختیار کر گیا، اور یاروں نے اسے حقیقت سے نکال کر اس درجہ افسانہ بنا دیا کہ اب بعض لوگ اسے تحقیق اور ریسرچ کے نام پر پیش کرتے ہیں۔

تو اس کی واقعیت کو دوسرے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور دونوں حالوں میں اس کی افسانویت ختم نہیں ہو رہی ہے:

مؤلف کربلا کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"حضرت حسین ؓ کو اگر اس بات کا پورا یقین ہو جاتا کہ کوفہ کے انتظامی حالات میں کیا انقلاب رونما ہو گیا ہے، وہ ادھر کا رخ نہ کرتے یا راستے ہی سے پلٹ جاتے، ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر ؓ سابق گورنر کوفہ جب باغیانہ سرگرمیوں کو کچلنے میں ناکام رہے تھے، عبیداللہ بن زیاد عامل بصرہ کو کوفہ کی حالت درست کرنے کے لیے بھیجا گیا"۔ (ص:۱۷۰)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

’’بیان ہو چکا ہے کہ عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کے انتظام کے لئے عارضی طور سے بصرہ سے یہاں بھیجا گیا تھا‘‘، (ص: ۲۰۳)

اس جگہ نہایت معصومانہ انداز میں یہ نوٹ لکھا گیا ہے:

’’وضعی روایتوں میں یہ لغوبات بھی کہی گئی ہے کہ امیر المومنین یزید نے اپنے والد کے غلام سرجون رومی سے کوفیوں کی باغیانہ سرگرمیوں کا حال سن کر وہاں کے انتظام کا مشورہ کیا، اس نے عبید اللہ کے وہاں بھیجنے کا مشورہ دیا، یہ سرجون جس کا صحیح نام سرجس تھا، محکمہ مالیات کا کارکن تھا، شاید ایک عیسائی رومی سے اسلامی مملکت کے انتظامی امور میں مشورہ کرنا بطور تنقیص کے بیان ہو، امیر المومنین جو اپنے دہ سالہ زمانہ ولی عہدی میں مہمات جہاد کے علاوہ کاروبارِ خلافت کا کلی تجربہ رکھتے تھے، عمال خلافت کی اہلیت اور کارکردگی کی قابلیت سے بذات خود واقف تھے ان کو محکمہ مالیات کے عیسائی کارکن سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ اگر مشورہ کرتے تو حضرت ضحاک بن قیس ؓ الفہری جیسے صحابی و عامل دمشق جیسے اعیان سے کرتے نہ کہ صیغۂ مالیات کے عیسائی کارکن سے‘‘۔ (ص: ۲۰۳)

یہاں مؤلف پر بری طرح ذہنی دباؤ پڑ رہا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اپنی اس بات میں وزن نہیں محسوس کر رہے ہیں، حالانکہ واقعہ کربلا کا اصل تخیل اسی نقطہ سے شروع ہوتا ہے، اور سرجون نصرانی کی رائے کے مطابق کوفہ کے انتظامات میں وہ سخت گیر قسم کا انقلاب رونما ہوا جس نے سیدنا حسین ؓ اور ان کے خاندان کی آخری پیشکش کو ٹھکرا کر قتل و غارت کا مظاہرہ کیا، اور وہ سب کچھ ہوا جو ایک سخت ترین سیاست کا کام ہو سکتا ہے، اگر سرجون نصرانی کے مشورے کے مطابق عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا انتظام نہ دیا گیا ہوتا، اور کوئی صلح پسند اور نرم دل آدمی وہاں کا گورنر بنا ہوتا تو شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا اور سیدنا حسین ؓ کی پیش کش کا خوشگوار اثر ظاہر ہوتا، اور سیدنا حسن ؓ کی طرح سیدنا حسین ؓ بھی خون خرابہ سے بچنے کی راہ نکالتے:

مناسب ہے کہ اس مقام پر مؤلف اور ان کے آزاد محققین و مستشرقین نے جو بے لاگ تحقیق کی ہے، اور مؤلف اسے واقعہ کربلا کے لئے آخری حجت بتا رہے ہیں۔ ہم اس کا پس منظر قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں، تا کہ اس سلسلہ میں ساری مسیحی تحقیق کی نوعیت ذہن میں آ جائے، اور معلوم ہو جائے کہ مسیحی مورخین اور مستشرقین شامی فوجوں کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے سیدنا حسین ؓ اور حسینی قافلہ ہی کیوں مجرم و خطا کار قرار دیتے ہیں صورت یہ ہے کہ اسلام سے

پہلے شام کا پورا علاقہ رومی ایمپائر کے زیر نگیں تھا، اور اس کے حکام شام میں تھے، خود شام کے غساسنہ (شاہان غسان) رومی شہنشاہیت کی نمائندگی کرتے تھے، اور چونکہ شام اور بیت المقدس کا سارا علاقہ عیسائیوں کے لئے مقدس تھا، اس لئے یورپ کی تمام مسیحی طاقتیں وہاں نظر جمائے رکھتی تھیں، اور وہ مسیحیوں کا دینی اور قومی ہی مرکز نہ تھا، بلکہ ان کی سیاست وحکومت اور تہذیب وتمدن کا بھی مشرقی گہوارہ تھا۔

خلافتِ راشدہ میں جب شام کا علاقہ فتح ہوا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں کا انتظام معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا، جو اسلام کی سیاسی دور اندیشی سے رومی اور مسیحی سیاست کا کاٹ کر سکتے تھے، چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کا پورا مقابلہ کیا، عہد فاروقی میں ان سے بحری جنگ کی اجازت طلب کی اور عہد عثمانی میں قبرص وغیرہ پر چڑھائی کرکے بار بار فتح حاصل کی، اور پھر جب شام پر ان کا اقتدار وقبضہ ہوا تو رومی ممالک پر مسلسل حملے کئے اور قسطنطنیہ تک ان کی فوجی طاقت کو سخت دھکا پہونچا اور شام کی نصرانی تہذیب کو اسلامی ثقافت سے بدل دیا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ رومیوں کے معاملہ میں نہایت سخت تھے، اور پوری طاقت سے ان کی حرکت کا مقابلہ کرتے رہے، چنانچہ ایک مرتبہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ اندرونی مشاجرات میں تھے، شاہِ روم نے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہا، تو معاویہ رضی اللہ عنہ کو بڑی تشویش ہوئی، اور آپ نے نہایت سخت جواب دیا، اور لکھا کہ اگر تو ہمارے آپس کے مشاجرات سے فائدہ اٹھا کر ہمارے ملک پر حملہ آور ہوگا تو میں علی رضی اللہ عنہ دونوں ساتھ مل کر تیرا مقابلہ کریں گے، اور میں آگے آگے ہوں گا۔

مگر افسوس سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی آنکھ بند ہوتے ہی شام کی طرف سے ہرقلیت اور رومی طرز سیاست اسلام پر حملہ آور ہوئی اور ان اغلیمہ کے اثر واقتدار کے دوش پر اسے پروان چڑھنے کا زرّیں موقع ہاتھ آ گیا، جو بنوامیّہ کی نئی حکومت کے قیام وبقا کے لئے یزید، مروان، عبیداللہ بن زیاد، عمر بن سعد کی طرح مسیحی سیاست دانوں کو بھی کام میں لائے جس کا نہایت مکروہ ظہور واقعہ کربلا کی شکل میں ہوا اور مسیحیت نے وہ کام کیا کہ آج تک اسلامی دنیا دست وگریبان نظر آ رہی ہے۔ بنوامیّہ کا مستقر شام کا شہر دمشق تھا، جو پہلے شامی بازنطینی تہذیب وفکر کا مرکز اور مسیحیت کا گہوارہ تھا، اور یہاں رومی طرز کی حکمرانی تھی، ہنگامی ضرورت کی وجہ سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں دیوان خراج میں کام کرنے کے لئے بعض نصرانی منصرموں اور کاتبوں کی خدمات حاصل کیں، چنانچہ شہر حمص کے خراج کی وصولی کے لئے ابن اثال نصرانی کو رکھا، نیز سوجون بن منصور رومی مسیحی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دیوان خراج کا کاتب تھا یہ شخص سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید، معاویہ بن یزید، مروان بن حکم، اور عبدالملک بن مرون کے زمانہ تک شام کے دیوان خراج کا منتظم اعلیٰ رہا۔

(کتاب الوزراء جہشیاری) اوراس کے ماتحت نصرانی عملہ کی ایک بڑی جماعت تھی، اس لئے اس کا اثر ورسوخ بڑھا اور یزید کا مشیر بھی بن گیا، اور وہ اپنے عمال و امراء کے عزل ونصب میں اس سے مشورہ کرنے لگا، یہ قدیم رومی حکومت کا زمانہ دیکھنے والا کاتب اپنے مذہب پر قائم تھا، اور بظاہر مسلمان حکومت کا ملازم بن کر بباطن روم کی مسیحی حکومت کا طرفدار تھا* اوران رومی ممالک پر اسلامی فتوحات سے راضی نہ تھا، ایسا آدمی کب صحیح مشورہ دے سکتا تھا اور اسلامی معاملات خصوصاً مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی میں امن وصلح کی بات کیسے کرسکتا تھا، وہ تولڑاؤ اور حکومت کرو کی قدیم پالیسی کا آدمی تھا، چنانچہ اس نے اوراس کے ساتھیوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے ایسے موقع کو غنیمت سمجھا، جس میں ایک طرف عرب کی سب سے بڑی طاقت (بنوامیّہ) ہو، اور دوسری طرف خاندان رسالت اوراس کے طرفدار دینی جذبہ کے ساتھ ہوں، اور جب یزید نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے ایسا مشورہ دیا جو اس کی مسیحی پالیسی کے عین مناسب تھا، اور جس کی ایک بے دین نصرانی سے توقع تھی، علامہ جہیشاری کی مشہور و معتبر کتاب الوزراء والکتاب میں ہے:

[ولما اتصل بیزید میسر الحسین رضی الله عنه الی الکوفة شاور سرجون منصور فیمن یولی العراق] (کتاب الوزراء والکتاب طبع مصر ص : ۳۱)

”جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ پہونچ جانے کی خبر یزید کے پاس پہونچی تو اس نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ کیا، کہ کس شخص کو عراق کا گورنر بنائے“۔

اس تصریح کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حادثہ کربلا میں یزید نے کس فکر وذہن کے مشورہ پر عمل کیا، اوراسے کس نے ایسے آدمی کو عراق کی گورنری کا مشورہ دیا جو پہلے ہی سے عصبیت وطرفداری میں مشہور تھا، اوراس معاملہ میں کسی شخصیت یا جماعت یا دیانت کی پرواہ نہیں کرتا تھا، اگر نصرانیت کی یہ چال کامیاب نہ ہوگئی ہوتی تو شاید یہ سانحہ پیش نہ آتا، اور آج تک عیسائی مصنفین اور مسیحی مورخین سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اوران کے ہمراہیوں کو غلط کار وخطاء کار ثابت کرکے یرموکی حکومت اوراس کے عمال کو نہ سراہتے، جس نے سرجون منصور نصرانی اوراس جیسے دوسرے اپنے دوسرے عیسائی اہل کاروں کے مشورہ سے یہ کام کیا، مغربی محققوں کی بے لاگ تحقیق اسی نصرانی مشورہ کی تصحیح وتصدیق سے یہ کام کیا، مغربی محققوں کی بے لاگ تحقیق اسی نصرانی مشورہ کی تصحیح وتصدیق کے لئے ہے جو اسلام میں ہمیشہ کے لئے افتراق وانشقاق پیدا کرنے کی غرض سے دیا گیا تھا، اموی دربار پر نصرانیوں کے تسلط کو عیسائی مورخین ومستشرقین نہایت فخر و

مباہات اور اہمیت کے ساتھ بیان کر کے اسلامی افکار و خیالات پر مسیحی علم و فلسفہ کے اثرات کو ثابت کرتے ہیں، چنانچہ ایک مسیحی مستشرق جان کریمر نے لکھا ہے:

”عیش و عشرت کی مشغولیت کی بنا پر اموی خلفاء نے عیسائیوں اور دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ بہت زیادہ رواداری برتی، نہ صرف یہ کہ عیسائیوں کو خلفاء کے دربار میں آزادی کے ساتھ داخلہ کی اجازت تھی، بلکہ انہیں اکثر اہم ترین ذمہ داری کے عہدے بھی دیئے جاتے تھے، سرجون جو یوحنائے دمشقی کا باپ تھا عبدالملک کے دربار میں مشیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھا، اور اس کی وفات پر یہ عہدہ اس کے بیٹے کو تفویض ہوا، یہاں تک کہ دربار کا ملک الشعراء ایک عیسائی اخطل ہی تھا، عیسائیوں کی حالت ایسی اچھی تھی کہ انہیں مساجد میں بے روک ٹوک جانے کی اور عام مجمعوں میں طلائی صلیب کے ساتھ چلنے پھرنے کی اجازت تھی الخ“۔

نکسن نے اس کی مزید توضیح یوں بیان کی ہے:

”عیسائیوں کو اموی خلفاء کے دربار میں آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کی اجازت تھی، نصرانی شاعر اخطل دربار کا ملک الشعراء تھا، اور اس کے ہم مذہب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، مسلمان اور عیسائی دوستانہ گفتگو نیز مذہبی مناظروں میں تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے“۔**

جس مسیحی یلغار کو بنوامیّہ کے ابتدائی جوشیلے نوخیزوں نے دعوت دی تھی، اور یزیدی اور مروانی دور میں جس نے اسلام دشمنی کے بڑے بڑے کام کئے اور حکمرانوں کو غلط مشورے دے کر بدلہ لیا، بعد کے اموی خلفاء نے اس کا سدباب کیا، اور یونانی جدلیات و مناظرہ اور بازنطینی اور عربی زندگی کو فروغ دیا، اور حتی الامکان عجمی اثرات سے اسلامی تعلیمات اور عربی طبائع کو دور رکھا، اسی لئے بنوامیّہ اپنے اوصاف میں بنوعباسیہ سے ممتاز مانے جاتے ہیں، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد نصرانیت اور رومیت کی جو روچل پڑی تھی، اگر بعد کے دوراندیش خلفاء اس کا مقابلہ کر کے شکست نہ دیتے تو یہ نصاریٰ اسی زمانہ میں اسلام کی سیاسی قوت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دینی اور فکری سرمایہ بھی ختم کر دیئے ہوتے۔

واقعات کربلا کے سلسلے میں بڑی سنجیدگی سے ان حقائق کو پیش نظر رکھئے، تا کہ اس پس منظر سے واقعات کو سمجھنے میں آسانی ہو، اور مؤلف (محمود احمد عباسی) کی پیدا کردہ الجھنیں دور ہوں۔

* یہ نصرانی سرجون رومی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ خلافت تک موجود رہا اور تمام دفتری کام رومی زبان میں انجام

دیے جاتے تھے تا آنکہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم سے دفتری کام عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے کردار کو المسلسل عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ میں مکمل طور سے دکھایا گیا ہے۔

** ہم نے یہ اقتباسات جناب محترم شبیر احمد خاں صاحب غوری، ایم، اے ایل، ایل بی بی ٹی رجسٹرار امتحانات یوپی کے ایک مقالہ برہان دہلی دسمبر ۱۹۵۹ سے لئے ہیں۔

مؤلف محمود احمد عباسی اور ان کے نصرانی محققین کی تحقیق

مؤلف ''خلافت معاویہؓ و یزید'' کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے، کہ انہوں نے جس واقعہ کو الٹ دینے کے لئے یہ کتاب لکھی، اور جس کے لئے ان کو سب کچھ کرنا پڑا اس میں ایک دلیل بھی کسی ثقہ یا غیر ثقہ اسلامی مورخ کے پاس نہ پا سکے، اور اپنے مفروضہ کے تمام تر دلائل ان اسلام دشمن مسیحیوں کی کتابوں سے بیان کئے جن کے آباء واجداد نے یزید کے ذریعہ یہ کھیل کھیلا تھا، اور جن کو شاباش دینے کے لئے آج تک مسیحی مورخ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو غلط کار بتاتے ہیں۔

واقعہ کربلا کا سارا الزام مؤلف نے قافلہ حسینی پر رکھا ہے، اور ان ہی کو حملہ آور قرار دے کر ان کی موت وشہادت کو ان کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو، عمر بن سعد کی مساعی جمیلہ کو سراہنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

''اس مطالبہ نے برادرانِ مسلم بن عقیل کو جو پہلے ہی سے جوش انتقام سے مغلوب ہو رہے تھے، مشتعل کر دیا، نیز ان کوفیوں کو بھی جو حسینی قافلہ میں شامل تھے اور جنہیں صلح ومصالحت میں اپنی موت نظر آ رہی تھی، یہ موقع ہاتھ آ گیا، انہوں نے اپنے پیش روؤں کی تقلید میں، جنہوں نے جمل کی ہوتی ہوئی صلح کو جنگ میں بدل دیا تھا، اس اشتعال کو اس شدت سے بھڑکایا کہ انتہائی ناعاقبت اندیشی سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے گھیرا ڈالے ہوئے تھے اچانک قاتلانہ حملہ کر دیا تھا، انہوں نے اپنے سپاہیوں کو جوابی حملہ یا جارحانہ اقدام سے روکے رکھا مدافعانہ پہلو سے آگے بڑھنے نہ دیا الخ''۔ (ص: ۲۱۹)

اس مفروضہ کی دلیل آپ کو کسی اسلامی مورخ ومصنف کے یہاں نہ مل سکی تو آپ نے حسب عادت ان الفاظ میں اسلام کے دشمن اور شربت زہر دینے والے مسیحی مورخوں کا حوالہ دیا:

''آزاد محققین ومستشرقین نے بے لاگ تحقیق سے اسی بات کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کے فوجیوں پر اس طرح اچانک

حملہ سے یہ حادثہ محزون پیش آیا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نویس نے (ص:۲۱۱) کہا ہے کہ۔۔۔"۔

اتنے بڑے دعویٰ کے لئے کسی بھی مسلمان مصنف کا قول نہ نقل کیا اور مسیحیوں کی اسلامی تاریخ نوازی پر اعتماد کرنا مؤلف "خلافت معاویہؓ و یزید" جیسے محقق کا کام تو ہو سکتا ہے، مگر کوئی غیرت مند مسلمان تو اسے گوارا نہیں کر سکتا اور نہ ہم ان کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، مسیحیوں کا قول ہمارے لئے ہرگز حجت نہیں ہے آپ اور آپ کے معتمد مستشرقین کی تحقیق کی رو سے سرکاری فوج نے کچھ نہیں کیا، بلکہ برادران مسلم اور کوفیوں نے امن پسند، صلح جو بہادروں پر خود حملہ کر دیا، پھر بھی اس پر عمر بن سعد کی مساعی جمیلہ سے اس کے فوجیوں نے جوابی کاروائی نہیں کی، بلکہ مدافعت کے لئے آگے بڑھنے کی جرات بھی نہ کی، مگر حسینی قافلہ کے ناعاقبت اندیش آگے بڑھتے رہے، اور بھیڑ کی طرح اپنے کو کٹواتے رہے، حتیٰ کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کام کیا اور حادثہ کربلا واقع ہو گیا، وہ بھی صرف آدھ گھنٹے تک جاری رہ کر ختم ہو گیا، مؤلف فرماتے ہیں:

"برادران مسلم اور ساٹھ پینسٹھ کوفیوں کی ناعاقبت اندیشانہ طور سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر اچانک قاتلانہ حملہ کر دینے سے یہ واقعہ محزون یکایک اور غیر متوقع پیش آ کر آدھ گھنٹے میں ختم ہو گیا"۔ (ص: ۲۲۳)

بھلا کوئی سمجھ دار آدمی باور کر سکتا ہے کہ ۶۰، ۶۵ کوفی اور خاندان حسین رضی اللہ عنہ کے چند افراد ایسی فوج پر حملہ کر سکتے ہیں، جو بقول مؤلف جنگ آزمودہ اور حرب وضرب میں کافی شہرت رکھنے والی تھی، اس حال میں بقول مؤلف یہ لوگ جنگ آزمودہ بھی نہیں تھے، اس کے باوجود ان ناعاقبت اندیش ناتجربہ کار قافلہ حسینی نے ان تجربہ کار اور جنگ آزمودہ فوجیوں کے اسی بہادروں کو اسی وقت مار ڈالا، اور خود ۷۲ کی تعداد میں مقتول ہوئے۔

مؤلف کا کہنا ہے کہ:

"لیکن تلوار چل جانے پر بھی اپنے سپاہیوں کو مدافعت کے پہلو پر (عمر بن سعد) نے قائم رکھا، جس کا بیّن ثبوت خود ان ہی راویوں کے بیان سے ملتا ہے، جہاں انہوں نے طرفین کے مقتولین کی تعداد بیان کی ہے کہ حسینی قافلہ کے بہتر مقتول ہوئے، جن میں اکثر و بیشتر جنگ آزمودہ نہ تھے، اور فوجی دستے کے جنگ آزمودہ سپاہی اٹھاسی مارے گئے گویا سولہ فوجی زیادہ کٹوا کر بھی وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی جان بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے"۔ (ص: ۲۱۳)

شاید دنیا کی تاریخ جنگ میں امیر عمر بن سعد کی فوج سے زیادہ امن پسند، صلح جو فوج نہیں گزری ہو گی، اور قافلہ حسینی سے

زیادہ ناعاقبت اندیش حملہ آور دنیا میں نہیں گذرے ہوں گے، اگر مؤلف کا یہ زعم کسی درجہ میں صحیح مان لیا جائے تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ فوجیں کس کی تھیں، جنہوں نے مکہ مکرمہ میں کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے، جبل ابو قبیس پر منجنیق نصب کر کے بیت اللہ پر گولہ باری کی، غلاف کعبہ کو آگ لگائی گئی، اور اللہ کے حرم کی حرمت کو ختم کر کے انسانی خون کی ہولی کھیلی گئی تو کیا مؤلف بتا سکتے ہیں کہ وہ کون فوجی تھے جنہوں نے واقعہ حرّہ برپا کر کے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوٹا، تین رات دن تک مدینہ منورہ کو مباح کر دیا تھا، اور انصار و مہاجرین کے خون کی نہریں جاری کی تھیں، انسانی عزت و عصمت پر ڈاکے ڈالے تھے، اور اللہ کے رسول کی مسجد کو تین دن تک بلا اذان و اقامت کے خالی رکھا تھا، یہ کون سورما تھے، نیز اسی طرح کے متعدد خونی معرکوں میں کون لوگ تھے، جنہوں نے بہادری و جوانمردی دکھائی تھی؟ کربلا کا صرف ایک ہی واقعہ ان کا کارنامہ نہیں ہے جسے مؤلف مسیحی مورخوں کی مدد سے چھپانے میں کامیاب ہو جائیں گے، ان امن کی فوجوں کے یہ بڑے بڑے کارنامے کہاں جائیں گے، جو آپ حادثہ کربلا کے معمولی واقعہ کو چھپا کر ان کو خدا ترس اور امن پسند ثابت کرتے ہیں، جن بہادروں نے حرم الٰہی کو لوٹا، اور حرم نبوی کو قتل و غارت کا بازار بنایا، اور خون ریزی اور خون آشامی کا بدترین ثبوت پیش کیا، ان کے لئے تو یہ بات بہت معمولی تھی، کہ قافلہ حسینی کے مٹھی بھر انسانوں کو دم کے دم میں بھون کر رکھ دیں، اور ان چند جنگ نا آزمودہ مردوں، بچوں اور عورتوں کو چشم زدن میں چٹ کر جائیں، اور مردانگی، اور جوانمردی کا وہ ثبوت پیش کریں جو کائنات کی تاریخ جنگ میں اپنی مثال آپ ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جیسا کہ آپ ہی کے بیان کی روشنی میں ہم بتاتے ہیں سنئے۔

شمر کی رپورٹ

’’حالانکہ طبری و دیگر مورخین نے ابو مخنف وغیرہ کی روایتوں کے مطابق بیان کیا ہے کہ یہ حادثہ بس اتنی دیر میں ختم ہو گیا جتنی دیر قیلولہ میں آنکھ جھپک جائے، یعنی کم و بیش آدھ گھنٹے میں‘‘۔ (ص: ۲۲۳)

مؤلف نے جیسا کہ بار بار اپنی کتاب میں کہا ہے، اس جگہ بھی پڑھنے والوں کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے، کہ یہ طبری اور دیگر مورخین کا بیان ہے، حالانکہ ان بے چاروں نے اپنی کتابوں میں شمر بن ذی الجوشن کی وہ تقریر نقل کی ہے، جو اس نے حادثہ کربلا کے بعد یزید کے سامنے کی تھی، اور اس میں یزیدی فوج کی بہادری اور جنگی مہارت کا فخریہ بیان کیا تھا، جیسا کہ فاتح فوجوں کی رپورٹیں اپنی حکومتوں کے سامنے ہوا کرتی ہیں، مگر مؤلف نے اسے مورخوں کا قول بنا دینے کی کوشش کی یہاں پر ہم قدیم ترین مورخ ابو حنیفہ دینوری کی کتاب ’’الاخبار الطوال‘‘ سے شمر کی پوری رپورٹ درج

کرتے ہیں۔

1

مورخ ابوحنیفہ دینوری لکھتے ہیں، کہ واقعہ کربلا کے بعد ابن زیاد نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے علی بن حسین رضی اللہ عنہما کو اور ان کے ہمراہ جو عورتیں تھیں، ان کو یزید کے پاس زجر بن قیس اور محقن بن ثعلبہ اور شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ روانہ کیا، یہ لوگ دمشق پہونچ کر یزید کے دربار میں داخل ہوئے، ان ہی کے ساتھ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر بھی داخل کیا گیا، اور یزید کے سامنے ڈال دیا گیا، پھر شمر ذی الجوشن نے گفتگو کی، اور کہا:

[يا امير المؤمنين، ورد علينا هذا في ثمانية عشر رجلا من اهل بيته، وستين رجلا من شيعته، فصرنا اليهم، فسألناهم النزول على حكم أميرنا عبيد الله بن زياد، او القتال، فغدونا عليهم عند شروق الشمس، فأحطنا بهم من كل جانب، فلما أخذت السيوف منهم ماخذها جعلوا يلوذون الى غير وزر [١] ، لوذان الحمام من الصقور، فما كان الا مقدار جزر [٢] جزوز، او نوم قائل [٣] حتى أتينا على آخرهم، فهاتيك اجسادهم مجرده، وثيابهم مرمله، وخدودهم معفره، تسفى عليهم الرياح، زوارهم العقبان [١] ، ووفودهم الرخم [٢] .] (الاخبار الطوال : ٢٦٠-٢٦١)

”اے امیر المومنین! یہ شخص (حسین رضی اللہ عنہ) اپنے اہل بیت سے اٹھارہ آدمیوں کو اور اپنے مددگاران (شیعہ) سے ساٹھ آدمیوں کو لے کر ہمارے پاس آیا، تو ہم ان سب کی طرف چلے اور ان سے کہا کہ یا تو ہمارے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ یا جنگ کرو، پھر صبح کو آفتاب کے نکلتے نکلتے، ہم نے ان پر دھاوا بول دیا، اور ان کو ہر جانب سے گھیرے میں لے لیا، اور ہماری تلواروں نے ان سے اپنی جگہ پکڑنی شروع کی تو وہ بے پناہ کی پناہ ڈھونڈ کر ادھر ادھر ہونے لگے، جیسے کبوتر باز سے پناہ ڈھونڈتے ہیں، پس صرف اتنی مقدار گذری جتنی موچی جوتا درست کر لے، یا قیلولہ کرنے والے کو نیند آجائے، کہ ہم نے ان کا صفایا کر دیا، دیکھئے یہ ان کے ننگے جسم ہیں ریگ میں اٹے ہوئے کپڑے ہیں، اور دھول میں پڑے ہوئے رخسار ہیں، ہوا ان پر چل رہی ہے ان کی زیارت کرنے والے عقاب ہیں، اور ان کے پاس آنے والے وفود گدھ ہیں“۔

مردان کارزار تو یزید کے سامنے اپنی جوان مردی اور بہادری کی روئداد ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں، اور آپ ہیں کہ ان کو بزدل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں آپ کی یہ کوشش نصرانیت کی تائید کے باوجود ہر طرح

بے کار رہے۔

مؤلف نے کمال بے انصافی کا ثبوت یہ بھی دیا ہے کہ حادثہ کربلا میں قافلہ حسینی اور سیدنا حسینؓ کو ناعاقبت اندیشانہ طور پر حملہ آور قرار دیتے ہوئے عمر بن سعد اور اس کی فوجوں کو معصومیت اور امن پسندی و صلح جوئی کو اس قدر بلند کیا ہے کہ مساعی صلح و مصالحت میں عمر بن سعد کو سیدنا علیؓ سے بڑھا دیا ہے، اور اس قسم کا مقابلہ و موازنہ کر کے اپنی بدنیتی کا کھلا ثبوت پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:

”عمر بن سعد اس موقع پر اس سے بھی زیادہ بے بس ہو گئے جیسے کہ جنگ جمل کے موقع پر حضرت علیؓ تھے، کہ قرآن دکھا دکھا کر فریقین کو برادر کشی سے روکتے رہے مگر بے سود“۔ (ص: ۲۲۰)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سیدنا علیؓ نے جنگ جمل کے موقع پر فریقین میں صلح و مصالحت کرانے کی کوشش کی، مگر عمر بن سعد کی کوشش صلح سیدنا علیؓ کی کوشش سے زیادہ تھی، اور قافلہ حسینی کی ضد اور ہٹ دھرمی سے عمر بن سعد کو اس سے زیادہ بے بس ہو جانا پڑا جس قدر سیدنا علیؓ جنگ جمل میں فریقین کی ضد سے بے بس ہو گئے تھے۔

ہم نے مانا کہ واقعہ کربلا کی روایات میں مبالغہ آمیزی ہے، اور شیعوں نے اسے خوب خوب رنگ دیا ہے، بہت سے غیر شیعہ لوگوں نے محبت اہل بیت یا بنوامیّہ کی دشمنی میں اس واقعہ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تمام مسلمان مورخوں اور سوانح نگاروں کو کذاب و مفتری قرار دے کر نصاریٰ کو اس معاملہ میں ثقہ، معتبر قرار دیا جائے، اور ان دشمنان اسلام کی بکواسوں کو واقعہ کربلا کے لئے معیار بنایا جائے۔

انہوں نے واقعہ کربلا کو اپنے منشا کے مطابق بنانے کے لئے صرف مغربی مسیحیوں کو حکم اور فصل مانا ہے، ہمیں بحیثیت مسلمان ہونے کے ان کا فیصلہ ان معاملات میں کیا ہے، اسلام کے کسی معاملہ میں ہرگز ہرگز تسلیم نہیں ہے، جسے ہمارے مورخین محدثین اور علماء بقول مؤلف صحیح بیان نہ کر سکے، اسے متعصب عیسائی مورخ اور مقالہ نگار صحیح طور پر کیا بیان کر سکتے ہیں، اور ان کو معلومات کہاں سے فراہم ہو سکتی ہے۔

سیدنا ابن عمرؓ اور قاتلین حسینؓ

مؤلف کے مزعومات کا تقاضا تو یہ ہے کہ حادثہ کربلا کے بعد وہ صحابہ جن کو ہم یزید کا ہم نوا اور سیدنا حسینؓ کا مخالف سمجھتے ہیں، وہ سیدنا حسینؓ اور ان کے خاندان کے قتل کو ان حضرات کی غلطی کے رنگ میں پیش کریں اور اسے ان

کے خروج کی سزا قرار دے کر یزیدی فوجوں کی امن پسندی وشرافت اور حسن عمل کی تعریف کریں، اور موقع بہ موقع ان کا شاباش دیتے ہوئے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی غلط روش پر افسوس کر کے، ان کو ان کے قتل کا سبب ثابت کریں، مگر واقعہ کربلا کے بعد فضا اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اور اجلہ صحابہ جن کو یزید کا طرفدار بتایا جا رہا ہے، قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو مجرم گردانتے ہیں اور ان کی دیانت وتقویٰ کی باتوں کو ریاء ونمائش پر محمول کرتے ہیں، اور صاف لفظوں میں موسم حج کے لاکھوں کے مجمع میں ان کو قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اور سارا قصور ان کے سر ڈالتے ہیں چنانچہ ''بخاری باب مناقب الحسن والحسین میں'' ہے کہ عراق کے ایک شخص نے آ کر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ کسی محرم کا بحالت احرام مکھی مارنا کیسا ہے اس پر سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

[فقال اهل العراق يسئلونى عن قتل الذباب ، وقد قتلوا ابن بنت رسول الله ﷺ وقال النبى ﷺ هما ريحانتاى من الدينا] (بخارى)

''عراق والے مجھ سے مکھی مارنے کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں حالانکہ ان ہی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادی کے بیٹے کو قتل کیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے وہ دونوں (حسن وحسین رضی اللہ عنہما) میرے لئے دنیا سے خوشبو ہیں''۔

یہ عراق کے لوگ کس کے آدمی تھے، یزید نے عبیداللہ بن زیاد کو کہاں کا گورنر اپنے مسیحی رومی سرجون بن منصور مشیر کے مشورہ سے بنایا تھا؟ اور یہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کس کے بارے مین فرماتے ہیں کہ کل کے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ آج مکھی مارنے کا مسئلہ دریافت کرتے ہیں، اور اپنے کو نیکوں کے نیک اور متقیوں کے متقی سمجھنے اور سمجھانے کی ترکیب نکال رہے ہیں۔

مؤلف اپنے متعصب مستشرقوں اور مورخوں کی تحقیق پر اعتماد کر کے جو چاہیں ثابت کریں کرائیں، مگر ہم امام بخاری اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو معتبر ومعتمد سمجھتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں نصرانی محققوں کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔

راس الحسین رضی اللہ عنہ

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر آپ کے نزدیک نہ کاٹا گیا، نہ کہیں اسے لے جایا گیا، اور اس کی روایتیں وضع ہیں، ان کا کسی سے تعلق نہیں ہے، امام بخاری نے باب مناقب الحسن والحسین رضی اللہ عنہما میں یہ روایت درج فرمائی ہے۔

[عن انس بن مالك قال آتى عبيد الله بن زياد براس الحسين فجعل فى طشت فجعل ينكت وقال فى حسنه شيأ فقال انس كان اشبههم برسول الله ﷺ وكان مخضوبا بالوشمة] (بخارى)

”سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبید اللہ بن زیاد کے پاس سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر لایا گیا اور ایک طشت میں رکھا گیا، اور عبید اللہ بن زیاد اسے لکڑی یا کسی چیز سے مارنے لگے، اور اس نے ان کے حسن وخوبی کے بارے میں کچھ نامناسب بات کہی تو سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حسین رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اور ان کا سر وقت وشمہ سے خضاب کیا ہوا تھا“۔

اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر نہیں کاٹا گیا، اور کربلا سے دوسری جگہ نہیں لے جایا گیا تو کیا کربلا اور کوفہ جہاں عبید اللہ بن زیاد کی گورنری تھی، دونوں ایک ہی جگہ کا نام ہے اور طشت میں کیا رکھا گیا تھا، یہ درست ہے کہ سر ایک جگہ ہی دفن ہوا، مگر تن سے جدا ہوا یا نہیں؟ اگر ہمت ہے تو بخاری کی اس حدیث کو بھی موضوع قرار دیجئے، آپ نے اس موقع پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کو حجت بنا کر اپنے مطلب کے لئے استعمال کیا (صفحہ: ۲۶۲، ۲۶۵) حالانکہ آپ ان کو بھی ان ہی مورخین میں شامل کر چکے ہیں، جو کذاب و مفتری ہیں، فرمایئے اب تاریخ ابن کثیر رحمہ اللہ کی روایت معتبر ہوگی یا بخاری شریف کی روایت؟

واقعہ حرّہ مدینہ منورہ

یزید کے ان کارناموں میں جن کا تعلق اس کی ذات سے نہیں، بلکہ اس کی خلافت وامارت اور عامۃ المسلمین سے ہے، دو کام نہایت مشہور ہیں، ایک حادثہ کربلا، اور دوسرا حادثہ حرّہ، یہ المیہ کربلا کے بعد نہایت ہی بری صورت میں پیش آیا، اور نقصان کے اعتبار سے بہت ہی مکروہ ثابت ہوا، مؤلف نے (ص: ۲۶۹، ۲۷۲) تک حرّہ کے واقعہ کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنے خاص رنگ میں بیان کیا ہے، اور واقعہ کربلا کی طرح یہاں بھی ان کا کمزور پہلو نمایاں رہا ہے کہ یزید اور اس کے کارناموں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اجلہ صحابہ اور پاک نیت بزرگوں پر نہایت رکیک حملے کئے ہیں، اور ان کی برائی پر یزید کی نیکی کی بنیاد رکھی ہے، ملاحظہ ہو فتنہ حرّہ کے عنوان کے بعد لکھتے ہیں:

”حادثہ کربلا کے بعد تین سال کے عرصہ تک کسی قسم کا کوئی ہنگامہ یا شورش نہیں ہوئی، ہر طرف امن وامان اور خوشحالی

(ص: ۲٦۸) کا دور دورہ رہا، تمام امور مملکت بحسن وخوبی انجام پاتے رہے، صرف ایک کانٹا تھا، اور وہ [1] حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا مکہ معظّمہ میں قیام، اور حکومت وقت کے خلاف پروپینگنڈا۔ اس پروپیگنڈے میں بھی خود انہوں نے یا ان کے ایجنٹوں نے کربلا کے فرضی مظالم کا اشارۃً کا کنایۃً مطلق ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس وقت تک خام خیالی مظالم کی روایتیں یا داستانیں وضع نہیں ہوئی تھیں، یہ حضرات تو خلیفہ وقت کے ذاتی مثالب ومعائب جو محض بے بنیاد تھے، بیان کر کے ناواقف مسلمانوں کو برافروختہ کر رہے تھے، پروپیگنڈا جب حد سے بڑھنے لگا تو مدینہ ہی کے بزرگوں نے جو امیر المومنین کے ذاتی حالات سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے، ان بہتانات کی تردیدیں کیں، بہتان تراشنے والوں کو جھڑکا ان سے بحثیں کیں، سمجھایا بجھایا''۔ (ص: ۲٦۹)

اس تمہیدی تحریر میں مؤلف نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے طرفدار صحابہ وتابعین کی شان میں جو گستاخی کی ہے، اور ان کا مفتری وبہتان طراز بتایا ہے، اور پرامن فضا میں فساد برپا کرنے کا ان پر الزام لگایا ہے، وہ صرف اس لئے کہ یزید اور اس کی فوج نے، حادثہ حرّہ میں حرام کاری وسیاہ کاری کی اسے جائز قرار دے کر اپنا مقصد ثابت کیا جائے حادثۂ کربلا اور حادثہ حرّہ کے درمیانی زمانہ کو امن وامان اور خوش حالی کی سند اس لئے دی گئی ہے، کہ اس دوران میں یزید اور اس کی فوج کو اور کوئی ایسا اہم کارنامہ دکھانے کا موقع نہیں مل سکا، جس ملک میں ''ملک عضوض'' کی برکتیں ظاہر ہوسکیں اور مسلمان بڑے صبر وضبط اور تحمل کے ساتھ خاموش رہ کر اندر ہی اندر گھل رہے تھے، اور یزید اور شامی فوجوں کے حق میں دعائے خیر یا ان سے راحت پاجانے کی دعا کر رہے تھے۔

مکہ مکرمہ پر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا قبضہ تھا، مگر مدینہ منورہ کلیۃً یزیدی سیاست کا مرکز تھا، اور اسے عضوضیت نے دمشق کے بعد اپنا دوسرا مقام بنا رکھا تھا، ایسی صورت میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں سے اہل مدینہ کا متاثر ہونا اور یزید کی بیعت توڑ کر اپنے لئے دوسرا والی مقرر کرلینا مؤلف کی سمجھ میں آسکتا ہے، مگر کسی سنجیدہ آدمی کے لئے اس کا سمجھنا محال ہے، جو مدینہ حسین رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان جیسے بزرگوں کے لئے تنگ ہوگیا، اور جس کے ایک ایک آدمی کی نقل وحرکت پر شامی فوج اور پولیس کڑی نگرانی کرتی تھی، وہاں کے لوگوں کا خارجی پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ہمنوائی کرنا مؤلف کے بیان کا کرشمہ ہے، اسے واقعات وحقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

مؤلف نے غالباً حادثہ حرّہ پر اس لئے زیادہ روشنی نہیں ڈالی کہ اس کی عام مسلمانوں میں وہ شہرت نہیں ہے جو کربلا کو حاصل ہے، مگر واقعہ کربلا کی وجہ بقول مؤلف اگر صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے چند اہل بیت تھے تو واقعہ حرّہ کی وجہ

پورے اہل مدینہ تھے جنہوں نے تحقیق وتفتیش کے بعد یزید کی بیعت توڑ کر اپنے لئے دوسرا حاکم منتخب کیا، جس کی پاداش میں مدینہ تین دنوں تک شامی فوجوں کے حوالہ رہا، اور انہوں نے اس حرم پاک میں سب کچھ کیا جسے کوئی وحشی سے وحشی تر فوج بھی اپنے مقبوضہ علاقہ میں نہیں کرسکتی، کئی ہزار صحابہؓ اور تابعینؒ کو یزیدی سیاست کی تلوار کھا گئی، حرم رسول کی عزت وحرمت ختم کردی گئی، صحابہ اور تابعین کے گھروں کو لوٹا گیا، ان کی حرم سراؤں کی عفت وعصمت لوٹی گئی، اور مسجد نبوی شریف میں اذان واقامت کی نوبت نہ آئی، اور اس اقدام کے چند دنوں کے بعد ہی دنیائے اسلام کو یزید کی طرف سے سکون مل گیا، اور اللہ تعالیٰ نے امت کی دعا قبول فرمائی۔

محاصرہ مکہ مکرمہ

مؤلف نے یزیدی دور کے تین مکروہ ترین واقعات میں واقعہ کربلا اور واقعہ حرّہ پر اپنے مفروضہ کے ماتحت خامہ فرسائی کی مگر محاصرہ مکہ مکرمہ کا تذکرہ نہیں کیا جس سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوجاتا کہ حرمین شریفین پر اس دور میں جو بقول مؤلف فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا مثیل تھا، کیا بیتی؟ اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پڑوسیوں پر یزیدی سیاست نے کیا کیا عنایت کی؟ مناسب ہے کہ یہاں پر اس المیہ کی طرف بھی اشارہ کردیا جائے، آخری ذوالحجہ ۶۳ ہجری میں شامی فوج کے امیر مسلم بن عقبہ مدینۃ الرسول کی لوٹ مار سے فارغ ہوکر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگ لے لئے مکہ مکرمہ کی طرف چلا، مدینہ منورہ کو فتح کرنے والی فوج اس کے ساتھ چلی مگر مسلم بن عقبہ ''ابواء'' پر پہونچ کر بیمار ہوگیا، اور اس فاتح مدینہ کو مکہ پہونچنا نصیب نہ ہوسکا، بلکہ وہیں اس کی وفات ہوگئی اس نے مرنے سے پہلے حصین بن نمیر کو شامی فوج کا امیر مقرر کیا، اور اس لشکر کو آگے بڑھنے کی ترکیب کرکے خود ابواء میں سپرد خاک ہوا، حصین ۲۶ محرم ۶۴ھ کو مکہ کے قریب پہونچا، اور اہل مکہ سے یزید کے کی بیعت کے لئے کہا، طرفین سے مقابلہ کی تیاری ہوئی، شامی فوج نے اپنے امیر کی سرکردگی میں جبل ابوقبیس اور جبل قیقعان پر منجنیق نصب کرکے خانہ کعبہ پر اس طرح سنگ باری کرنے لگی کہ کوئی آدمی بیت اللہ کا طواف نہیں کرسکتا تھا، اسی حال میں صفر کا پورا مہینہ گذر گیا، اور تیسری ربیع الاول کو شامی فوج نے خانہ کعبہ پر آگ برسائی، چھت اور پردے جل کر گیاہ ہوگئے، اور ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو جبکہ مکہ میں جانبین سے جنگ جاری تھی اور شامی فوجیں بڑھ بڑھ کر حرم رسول کے بعد حرم خدا کی حرمت لوٹ رہی تھیں، یزید کی موت واقع ہوگئی۔

یہ تین واقعات یزیدی دور کے نہایت اہم ہیں اور ان میں سے ہر ایک بجائے خود نہایت ہی سنگین ہے، مگر واقعہ کربلا کو ایک گروہ نے اپنی سیاست کے لئے مذہبی نشان بنایا، اور اس میں رنگ آمیزی کی، اور دو واقعات کتابوں کے اوراق

میں دفن ہیں۔

قاتل حسین ؓ عمر بن سعد

مؤلف لکھتے ہیں ”عمر بن سعد“ کو قتل حسین ؓ سے جب متہم کیا جانے لگا تو متاخرین میں سے بعض کو ان کی مروی حدیث لینے میں تامل ہوا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ فی نفسہ تو غیر متہم تھے لیکن قتال الحسین ؑ میں حصہ لیا تھا، اس لئے وہ کیسے ثقہ سمجھے جائیں۔ (میزان الاعتدال ۲۵۸ / ۲) علامہ ذہبی ؒ کا زمانہ ان کے زمانہ سے تقریباً سات سو برس بعد کا زمانہ ہے، جب ابو مخنف وغیرہ کی روایتوں کی اشاعت سے حادثہ کربلا کی صورت کا ذہبہ عام طور سے لوگوں کے ذہن نشین ہو چکی تھی، اور کسی مورخ کو ان وضعی روایات کی تنقید کرنے کی توفیق نہیں ہوئی جو صحیح حالات کا انکشاف ہو جاتا، غالباً سوائے ابن خلدون کے جن کی کتاب کے دو تین ورق جو حادثہ کربلا کے بارے میں ہیں ایسے غائب ہوئے کہ تقریباً پانچ سو برس کی مدت گزر جانے کے پر بھی آج تک کسی کو دستیاب نہ ہو سکے۔ (ص: ۲۱۵)

حسب معمول مؤلف نے ان باتوں کو لکھتے وقت ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کی کہ اگر کوئی اس بات کی تحقیق کر بیٹھے اور اصل سے مقابلہ کرے تو کیا حال ہوگا؟ اسی بیان سے ایک سطر اوپر مؤلف نے ”تہذیب التہذیب“ کی عبارت کو نقل کیا ،جس کا آخری پیرا اور اس کا ترجمہ آپ کی زبان میں یہ ہے:

[وقال العجلی کان یروی عن ابیہ احادیث وھو تابعی ثقۃ] (تہذیب التہذیب ص ۴۵۰)

”اور محدث عجلی فرماتے ہیں کہ (عمر بن سعد) نے اپنے باپ سے حدیث کی روایت کی ہے، اور ان سے بہت سے لوگوں نے اور وہ خود ثقہ تابعی تھے“۔

اس میں ”اور ان سے بہت سے لوگوں نے“ کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ اس تحریفی ترجمہ کی کیا ضرورت تھی جبکہ امام عجلی کی عبارت میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے، یہ تو یوں ہی ایک بات تھی، اس میں اصل بد دیانتی یہ ہے کہ اس کے بعد والی عبارت کو نقل نہیں کیا، اور امام عجلی کی آدھی عبارت نقل کر کے اپنا تعصب نکالنا چاہا ہے، پورا فقرہ یہ ہے:

[وھو تابعی ثقۃ وھو الذی قتل الحسین]

”وہ ثقہ تابعی ہے اور وہی ہے جس نے حسین ؓ کو قتل کیا“۔

اس کے بعد یہ عبارت ہے۔

[وذکر ابن ابی خیثمة بسند له ان ابن زیاد بعث عمر بن سعد علی جیش لقتال الحسین و بعث شمر بن ذی الجوشن وقال له اذهب معه فان قتله والا فاقتله وانت علی الناس وقال ابن ابی خیثمة عن ابن معین کیف یکون من قتل الحسین ثقة (ص ①⑤④) قال عمرو بن علی سمعت یحیی بن سعید یقول ثنا اسمعیل ثنا العیزار عن عمر بن سعد ، فقال له موسی رجل من بنی ضبیعة یا ابا سعید هذا قاتل الحسین فسکت فقال له عن قاتل الحسین تحدثنا فسکت ، وروی ابن خراش عن عمرو بن علی نحو ذلك وقال فقال له رجل اما تخاف الله تروی عن عمر بن سعد فبکیٰ وقال لا اعود وقال الحمیدی ثنا سفیان عن سالم قال قال عمر بن سعد للحسین ان قوما من السفهاء یزعمون انی اقتلك فقال الحسین لیسوا سفهاء ثم قال والله انت لا تاکل برالعراق الا قلیلاً] (تہذیب التہذیب ص ۴۵۰)

’’اور محدث ابن ابی خیثمہ نے اپنی سند سے بیان کیا کہ ابن زیاد نے عمر بن سعد کو امیر لشکر بنا کر حسین رضی اللہ عنہ سے قتال کے لئے بھیجا اور شمر بن ذی الجوشن کو اس کے ساتھ یہ کہہ کر بھیجا کہ اگر عمر بن سعد ان کو قتل نہ کرے تو تم ان کو قتل کرنا اور ان لوگوں کے امیر ہو گے، اور محدث ابنِ ابی خیثمہ نے امام یحییٰ بن معین کا قول نقل کیا ہے جس آدمی نے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے، وہ ثقہ کیسے ہو سکتا ہے؟ محدث عمرو بن علی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے سنا ہے انہوں نے کہا کہ ہم سے اسمعیل نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ ہم سے عیزار نے عمر بن سعد سے حدیث بیان کی ہے اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بنی ضبیعہ کے ایک آدمی موسیٰ نامی نے عیزار سے کہا سے ابو سعید (عیزار کی کنیت) یہ عمر بن سعید جس سے آپ روایت کر رہے ہیں قاتل حسین رضی اللہ عنہ ہے، یہ سن کر عیزار خاموش ہو گیا، اس آدمی نے کہا آپ قاتل حسین رضی اللہ عنہ سے ہم سے حدیث بیان کرتے ہیں، یہ سن کر وہ رونے لگے، اور کہنے لگے میں پھر ایسا نہیں کروں گا (امام بخاری کے استاد) امام حمیدی نے کہا کہ ہم سے سفیان نے بیان کیا حضرت سالم سے (جو کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں) انہوں نے کہا کہ عمر بن سعد نے حسین رضی اللہ عنہ سے کہا کچھ کمینے لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں آپ کو قتل کر دوں گا، یہ حسین رضی اللہ عنہ نے کہا وہ لوگ کمینے اور بیوقوف نہیں ہیں، پھر آپ نے فرمایا اللہ کی قسم تم عراق کا گیہوں بہت دن تک نہ کھا سکو گے‘‘۔

امام ابن ابی حاتم رازی متوفیٰ ۳۲۷ھ۔ نے ''کتاب الجرح والتعدیل'' میں عمر بن سعد کا تذکرہ کیا ہے اور[1] لکھا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص زہری کوفی نے اپنے والد سے روایت کی ہے، اور اس سے عیزار بن حریث نے، ابو اسحاق ہمدانی، ابوبکر بن حفص، یزید بن ابی حبیب، مطلب بن عبداللہ بن حنطب اور محمد بن عبدالرحمن بن ابی لبیبہ نے روایت کی ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں:

[حدثنا عبد الرحمٰن اخبرنا ابو بكر بن ابى خيثمة فيما كتب الىٰ قال سالت يحيىٰ بن معين عن عمر بن سعد ثقة هو فقال (ص ١١١) كيف يكون من قتل الحسين بن على رضى الله عنه ثقة (كتاب الجرح والتعديل ١١٢/٣ قسم اوّل)

''ہم سے عبدالرحمٰن نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ ہمیں امام ابوبکر بن ابی خیثمہ نے خبر دی ہے کہ میں نے خود امام یحییٰ بن معین سے عمر بن سعد کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ ثقہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو قتل کیا ہے وہ ثقہ کیسے ہو سکتا ہے؟

مؤلف کتاب نے بڑی دلیری سے ''تہذیب التہذیب'' سے محدث عجلی کی آدھی عبارت ''وھو الذی قتل الحسین'' کو چھپایا، اس کے بعد امام یحییٰ بن معین کے قول کو جو ''تہذیب التہذیب'' کے اُسی صفحہ پر ہے چھپایا اور عمر بن سعد کے غیر ثقہ ہونے کی تصریح کو متاخرین میں سے بعض کے تامل سے تعبیر کر کے امام ذہبی متوفیٰ ۷۴۷ھ کا قول نقل کیا، اور سات سو برس کا زمانہ بیچ میں لا کر ان کو اور دوسرے تمام محدثین کو تنقید کی توفیق سے محروم قرار دیا۔

عمر بن سعد کو غیر ثقہ اور قاتل حسین رضی اللہ عنہ بنانے والوں میں ابن معین کا قول سب سے اہم ہے، اور متعدد محدثین نے اسے نقل کیا ہے، امام یحییٰ بن معین کی وفات ۲۳۷ھ۔ میں ہوئی، اور ''کتاب الجرح والتعدیل'' میں ابن معین کا یہ قول صرف دو واسطوں سے مروی ہے، مصنف ابن ابی حاتم رازی اور ابن معین کے درمیان محدث عبدالرحمٰن اور محدث ابن ابی خیثمہ دو حضرات ہیں، اور یہ سب کے سب اسماء الرجال اور علم الجرح والتعدیل کے مسلّم امام ہیں۔

عمر بن سعد کو مختار ثقفی نے ۶۷ھ۔ یا ۶۶ھ۔ میں قتل کیا، امام یحییٰ بن معین نے ۲۳۷ھ میں وفات پائی، اور کتاب الجرح والتعدیل کے مصنف امام ابن ابی حاتم رازی ۳۲۷ھ۔ میں فوت ہوئے۔

مؤلف کا کہنا ہے کہ سات سو برس کے بعد ذہبی نے میزان الاعتدال میں عمر بن سعد کو غیر ثقہ بنایا ہے، انہوں نے''

تہذیب التہذیب'' اور ''الجرح والتعدیل'' سے فن جرح وتعدیل کے امام ابن معین کے قول کو چھپایا جو عمر بن سعد کے قتل کے تقریباً پونے دوسو برس بعد فوت ہوئے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک مقام پر مختار بن ابی عبید ثقفی اور عمر بن سعد میں مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ مختار جس نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی طرفداری ظاہر کر کے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے بدلہ لیا دعویٰ کرتا تھا، کہ میرے پاس وحی آتی ہے، اس لئے وہ عمر بن سعد قاتل حسین رضی اللہ عنہ سے برا ہے۔

[ومن المعلوم ان عمر بن سعد ، امير السرية التى قتلت الحسين ، مع ظلمه و تقديمه الدنيا على الدين لم يصل فى المعصية الى فعل المختار بن ابى عبيد الذى اظهر الانتصار للحسين وقتل قاتله] (المنتقىٰ : ۷۵)

''یہ بات معلوم ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل فوجہ دستے کا افسر عمر بن سعد اپنے علم اور دین پر دنیا کو مقدم کرنے کے معصیت میں مختار بن ابی عبید کے درجہ کو نہیں پہونچا، جس نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نصرت کو ظاہر کیا، اور ان کے قاتل عمر بن سعد کو قتل کیا''۔

اس سے پہلے اسی بحث کے ضمن میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

[ان عمر بن سعد كان طالباً للرياسة مقدماً على المحرم معروفا بذلك] (ص : ۷۳)

''عمر بن سعد ریاست کا طالب اور حرام پر جری تھا، اور اس میں مشہور تھا''۔

یقیناً مختار ثقفی اللہ ورسول پر افترا کرنے اور اپنے لئے دعویٰ وحی کرنے کی وجہ سے جرم و معصیت میں عمر بن سعد سے کہیں آگے تھا، مگر علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بیان کی رو سے بھی عمر بن سعد قاتل حسین رضی اللہ عنہ بایں معنیٰ ثابت ہو رہا ہے کہ وہ حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے والے فوجی دستہ کا افسر تھا، اور اسی کی کمان میں شہادت حسین رضی اللہ عنہ واقع ہوئی، نیز علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بیان کی رو سے وہ طالب راجاہ وریاست تھا، اور حرام کام کرنے میں آگے تھا، اور اس معاملہ میں مشہور و معروف تھا، اگر سات سو برس کے بعد ذہبی رحمہ اللہ نے عمر بن سعد کو غیر ثقہ بتایا تو ابن تیمیہ نے کتنے برس بعد عمر بن سعد کو'' كان طالباً للرياسة مقدماً على المحرم معروفاً بذلك'' قرار دیا ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس بیان کی روشنی میں عمر بن سعد کو عبید اللہ بن زیاد کے علاقہ پیش کرنے کا واقعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، جسے مصنف نے ص ۲۰۲ اور

ص ۲۰۳ پر غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس طالبِ جاہ اور محرمات پر جرات دکھانے والے سے کیا بعید ہے بلکہ عین ممکن ہے۔

واضح رہے کہ یہ مورخوں کے بیانات نہیں ہیں، بلکہ ان حضرات محدثین کرام کی تصریحات ہیں اور ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال ہیں، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال افعال اور مرضیات کو جمع کرنے کے لئے پانچ لاکھ سے زائد راویوں کے حالات جمع کئے ہیں، اور ہر راوی کی عدالت وثقاہت یا ضعف ومجروحیت کو مخفی سے مخفی گوشوں سے تلاش کر کے جمع کر دیا ہے، عمر بن سعد کو قاتل حسین رضی اللہ عنہ ہونے کی وجہ سے غیر ثقہ قرار دینے والوں میں حضرات ابن معین رحمہ اللہ فن جرح وتعدیل کے مسلّم امام ہیں، اور اس معاملہ میں ان کا فیصلہ ہے کہ جن حضرات کے بارے میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اتنے بزرگ ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے خیمے جنت میں لگ جاتے ہیں، جب ہم حدیث رسول کے معاملہ میں جرح وتعدیل کی کسوٹی پر ان کو گھستے ہیں اور وہ ہمارے اصولوں پر پورے نہیں اترتے تو صاف لفظوں میں ہم ان کو کذاب ودجال کہہ دیتے ہیں۔

ان ائمۂ حدیث پر یہ الزام کہ انہوں نے تحقیق نہیں کی، اور وضعی روایات کو آنکھ بند کر کے نقل کر دیا جرأت وبے باکی کی انتہاء ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں جو فوج تھی، اس کا سپہ سالار عمر بن سعد کا ہونا مؤلف کو بھی تسلیم ہے، مگر اس کا قاتل حسین رضی اللہ عنہ ہونا تسلیم نہیں ہے، اور جن محدثین نے اسے قاتل حسین رضی اللہ عنہ بتایا ہے، ان کی عبارت میں تحریف کی یا اسے نقل ہی نہیں کیا، ان کو چاہیے تھا کہ اس کے قاتل حسین رضی اللہ عنہ نہ ہونے کی کوئی عبارت نقل کرتے مگر مسلمانوں کے یہاں سے کوئی ایسی عبارت نہ مل سکی، اور مستشرقین یورپ کے اقوال نقل کرنے پڑے، کیا خوب بات ہے کہ جس بات کو اسلامی مورخین آپ کے زعم میں صحیح نہ بیان کر سکے اسے آج کل کے عیسائی مورخ صحیح بیان کرتے ہیں، مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائی مورخوں سے استدلال آپ کی روشن خیالی اور ریسرچ کا نمایاں پہلو ہے، اور آپ کے نزدیک مسلمانوں کے داخلی معاملات اور فتنوں کے مستند مورخ مغربی مسیحی ٹھہرے ہیں، گویا وہ مسلمان مورخوں سے زیادہ ثقہ و معتبر ہیں، اور وہ مسلمانوں کی تاریخ کے محقق بنیں۔

ظاہر ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل کو جن یا فرشتہ نہیں تھا، اور نہ مؤلف ان کے قتل کو ان کے خاندان کے کسی فرد کا کام بتاتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے جو لوگ مقابل تھے، ان ہی میں سے کسی نے یہ کام کیا ہے، آخر کسی کا

نام تو لینا ہی پڑے گا اور یہ واقعہ ہے کہ عمر بن سعد نے خود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے مقابلہ نہیں کیا بلکہ اس کی فوج کے لوگوں نے یہ کام کیا، درحقیقت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو اس کے آدمیوں نے قتل کیا، جو اسی کی کمان میں لڑ رہے تھے، اس لئے قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت اس کی طرف کی گئی، مؤلف نے اس بحث میں مورخ ابوحنیفہ دینوری متوفی ۲۸۱ھ۔ یا ۲۸۲ھ۔ یا ۲۹۰ھ۔ کا قول اس تمہید کے ساتھ نقل کیا ہے ''قدیم ترین مورخ (صاحب اخبار الطوال) لکھتے ہیں، (ص ۲۱۳)'' ہم اسی قدیم ترین مورخ کے بیان کے کچھ ٹکڑے اس کی کتاب الاخبار الطوال سے نقل کرتے ہیں جو عین قتال کے موقع سے تعلق رکھتے ہیں، ملاحظہ ہو:

[فنادیٰ عمر بن سعد فی اصحابه ان انهدوا الی القوم الیهم عشیة الخمیس ولیلة الجمعته لتسع لیال خلون من المحرم] (الاخبار الطوال : ۱۵۳)

''عمر بن سعد نے اپنے لشکر میں ندا کی کہ قوم (حسین رضی اللہ عنہ اوران کے طرفداروں) پر حملہ کرو، چنانچہ اس کے لشکری ان کی طرف بڑھے، یہ واقعہ جمعرات کی شام اور جمعہ کی رات ۹ محرم کا ہے، (حسین رضی اللہ عنہ نے صبح تک مہلت چاہی تو مہلت دے دی گئی) چند سطروں کے بعد یہ قدیم ترین مورخ لکھتے ہیں:

[ولما صلی عمر بن سعد الغداة فحفض باصحابه وعلی میمنة عمرو بن الحجاج وعلی میسرة شمر بن ذی الجوشن الخ] (ص : ۱۵۳)

''جب صبح کی نماز عمر بن سعد نے پڑھ لی تو اپنے لشکر کو تیار کیا میمنہ پر عمرو بن حجاج اور میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن تھا''۔

[و نادیٰ عمر بن سعد مولاه زیداً ان قدم الرایة فتقدم بها وسبت الحرب] (ص :۱۵۴)

''اور عمر بن سعد نے اپنے غلام زید کو پکارا کہ جھنڈا لے کر آگے بڑھ وہ آگے بڑھا اور گھمسان کی لڑائی ہونے لگی''۔

پھر واقعہ کربلا ہو جانے کے بعد اسی سپہ سالار کے بارے میں لکھتے ہیں:

[وبعث عمر بن سعد براس الحسین من ساعته الی عبید الله بن زیاد مع خولی بن یزید الاصبحی واقام عمر بن سعد بکربلاء بعد مقتل الحسین یومین ، ثم اذن فی الناس بالرحیل] (۷/۲۵۶)

''اور عمر بن سعد نے اسی وقت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سر کو عبید اللہ بن زیاد کے پاس خولی بن یزید اصحی کے ہمراہ روانہ کیا،

اور خود عمر بن سعد کربلا میں قتلِ حسین ؓ کے بعد دو دن تک ٹھہرا رہا، پھر لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم دیا''۔ [1]

مورخ ابوحنیفہ الدینوری قدیم ترین مورخ ہیں، اور ان کے یہاں ابومخنف جیسے رطب و یابس بیان کرنے والوں کا نام و نشان نہیں ہے، ان کی عبارتوں سے کیا واضح ہوتا ہے، اس کا فیصلہ کرنا مشکل نہیں، مگر ایک قدیم مورخ کے بیانات ملاحظہ فرمایئے جسے مؤلف نے کذاب و مفتری نہیں کہا، بلکہ اپنی کتاب میں جگہ جگہ اس کی کتاب کے حوالے نقل کئے ہیں، یہ دوسرے قدیم وثقہ مورخ علامہ ابن قتیبہ دینوری ۲۷۶ھ۔ میں فوت ہوئے ہیں، اور ابوحنیفہ دینوری کے ہم وطن اور معاصر ہیں، ان کی ''کتاب المعارف'' انتساب کی مشہور و معتبر کتاب ہے، اور مؤلف نے اس کتاب سے جگہ جگہ استناد کیا ہے۔

علامہ ابن قتیبہ دینوری سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ کی الاد کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

[فاما عمر بن سعد فهو قا~تل حسين بن على رضى الله عنهما وكان عبيد الله بن زياد وجهه لقتاله فلما كان ايام المختار بعث الى عمر بن سعد ابا عمرة مولىٰ بحيلة فقتله و حمل راسه اليه] (كتاب المعارف ص : ١٠٧ طبع مصر)

''عمر بن سعد سیدنا حسین بن علی ؓ کا قاتل ہے، اور عبیداللہ بن زیاد نے اسے حسین ؓ سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا تھا، اور جب مختار ثقفی کا زمانہ آیا تو اس نے بحیلہ کے غلام ابوعمرو کو عمر بن سعد کے پاس بھیجا اس نے عمر کو قتل کر کے اس کا سر مختار ثقفی کے پاس بھیجا''۔

سیدنا علی ؓ کے تذکرہ میں سیدنا حسین ؓ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[فخرج يزيد الكوفة فوجد اليه عبيد الله بن زياد عمر بن سعد بن ابى وقاص فقتله سنان بن انس النخعى] (ص : ٩٣)

''سیدنا حسین ؓ کوفہ کا ارادہ کر کے نکلے، تو عبیداللہ بن زیاد نے ان کی طرف عمر بن سعد بن ابی وقاص کو روانہ کیا، اور ان کو سنان بن ابی انس نخعی نے قتل کیا''۔

یزید کے ذکر میں لکھتے:

[و اقبل الحسين بن على رضى الله عنهما ، يريد الكوفة و عليه عبيد الله بن زياد من

قبل یزید فوجد الیه عبید الله عمر بن سعد بن ابی وقاص فقاتله فقتل الحسین رحمه الله تعالیٰ علیه و ورضوانه] (ص :۵۳۴)

’’اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما کوفہ کے ارادے سے نکلے، اس وقت کوفہ پر یزید کی طرف سے عبیداللہ بن زیاد گورنر تھا، اور اس نے حسین رضی اللہ عنہ سے جنگ کی، اس نے حسین رضی اللہ عنہ کی طرف عمر بن سعد بن ابی وقاص کو بھیجا، اور اس نے حسین رضی اللہ عنہ سے جنگ کی اور حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کردیا ‘‘۔

مؤلف نے ص ۲۰۸ سے ص ۲۱۲ تک کردار عمر بن سعد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور اس کے کارناموں کو شمار کیا، وہ سب اسی قبیل میں سے ہیں تا کہ وہ واقعی اس کام سے دور بھاگتا تھا، مگر اس پر اس قدر سختی ہوئی کہ مجبوراً ایسا کرنا پڑا اور یہ ڈیوٹی بجالانے کے بعد بھی اسے حد درجہ خدشہ رہا اور صاحب اخبار الطوال نے لکھا ہے کہ حمید بن مسلم کا بیان ہے کہ میں عمر بن سعد کا دوست تھا جب وہ قتال حسین رضی اللہ عنہ سے واپس ہوا تو میں نے جا کر اس سے خیریت دریافت کی اس نے کہا:

[لا تسأل عن حالی فانه ما رجع غائب الی منزله بشر مما رجعت به قطعت القرابة القریبة وارتکبت الامر العظیم] (ص : ۲۵۷)

’’یہ حال نہ پوچھو کیونکہ کوئی غائب ہونے والا اپنے گھر کی طرف اس سے بڑی برائی لے کر نہیں لوٹا جتنی بڑی برائی لے کر میں لوٹا ہوں میں نے بہت ہی قریبی قرابت کو کاٹ دیا اور بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہو گیا‘‘۔

مورخوں نے ان تمام باتوں کو دیانتداری سے بیان کردیا ہے اگر بان کی اسی غیر جانبداری اور ذمہ داری پر مؤلف جگہ جگہ حرف رکھتے ہیں کہ یہ مورخین عمر بن سعد کے بارے میں یہ بھی لکھتے اور قاتل حسین رضی اللہ عنہ بھی بتاتے ہیں۔

ساتھ ہی مؤرخین نے نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے کہ عمر بن سعد کسی قیمت پر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے کرنے کے لئے تیار نہ تھا، اس نے انتہائی دباؤ سے یہ کام کیا، اور واپسی پر اس حادثہ پر بڑے دردانگیز لہجہ میں اپنے تاثرات بیان کئے اور اہل بیت کو جو بچ گئے تھے بڑے احترام کے ساتھ یزید کے پاس روانہ کیا۔

کیا دلچسپ بات ہے کہ مؤلف نے بعض لوگوں کو پروپیگنڈے کا شکار بنا کر عمر بن سعد کی صحابیت میں شبہات ظاہر کرنے کا الزام دیا ہے، اور خود اسے تابعی مان کر ’’طبقات ابن سعد‘‘ اور ’’تہذیب التہذیب‘‘ کا حوالہ دیا ہے۔

کیا کوئی ایسا طبقہ بھی آپ نے تلاش کیا ہے جو بیک وقت تابعی بھی ہو اور صحابی بھی، یا عمر بن سعد کے واسطے یہ نیا نظریہ

ظاہر کیا ہے؟

مؤلف نے عمر بن سعد کو صحابی ثابت کرنے کے لئے بڑے بڑے محدثین، ائمہ جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے ماہرین پر الزام لگایا ہے، اور ان کی عبارتوں میں نہایت بے باکی سے تحریف کی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

’’محدث ابوبکر بن فتحون مالکی کی روایت سے اس شبہ کا ازالہ ہو جاتا ہے، یہ بزرگوار محدثین کی اس جماعت میں شامل تھے جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کی معتبر کتاب ’’الاستیعاب‘‘ کا ذیل لکھا تھا چنانچہ وہ ابن اسحاق کی سند سے یہ روایت لکھتے ہیں کہ عمر بن سعد عہد فاروقی کے مجاہدین میں کب اور کیونکر شامل ہوئے‘‘۔ (ص: ۲۱۲)

اس کے بعد آپ نے حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ ص ۱۷۳ سے ابن فتحون کی وہ عبارت نقل کی ہے، جس میں عمر بن سعد کے عہد فاروقی کے مجاہدین میں شامل ہونے کی جھوٹی کہانی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں چار قسمیں مقرر کی ہیں، چوتھی قسم میں ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جن کو غلطی سے صحابہ میں شمار کیا گیا ہے اور وہ صحابہ میں سے نہیں ہیں، ابن حجر ایسے لوگوں کے نام لکھ کر وہ غلط روایات بیان کرتے ہیں، جو ان کے صحابی ہونے کے لئے وضع کی گئی یا بیان کی گئی ہے پھر اس کی غلطی بیان کرتے ہیں، چنانچہ ’’باب السمین‘‘ میں آخری قسم کا عنوان بھی بیان کیا ہے ’’القسم الرابع فيمن ذكر منهم غلطا و بيانه‘‘ یعنی چوتھی قسم ان لوگوں کے بیان میں جو غلطی سے صحابہ کی جماعت میں شمار کئے گئے، اور اس غلطی کا بیان، اس قسم میں عمر بن سعد کا نام لکھ کر ابن فتحون کی وہی روایت ’’ذکرہ ابن فتحون فی الذیل‘‘ یعنی اس کا ذکر ابن فتحون نے ’’الاستیعاب‘‘ کے ’’ذیل‘‘ میں کیا ہے، لکھ کر پوری عبارت نقل کر دی اور اس کے بعد اپنا فیصلہ یوں سنایا:

[قلت قد جزم امام المحدثين يحيىٰ بن معين بان عمر بن سعد ولد فى السنة اللتى مات فيها عمر بن الخطاب ، ذكر ذلك ابن ابى خيثمة فى تاريخه] (الاصابة طبع جديد مصر ۱۷۲/۳)

’’میں کہتا ہوں کہ امام المحدثین یحییٰ بن معین نے نہایت وثوق سے بیان کیا ہے کہ عمر بن سعد اس سال پیدا ہوا جس میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا یہ ابن ابی خیثمہ نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے‘‘۔

مؤلف نے انتہائی خیانت سے کام لیتے ہوئے ’’الاصابہ‘‘ کا حوالہ دے کر ابن فتحون کی غلط روایت سے عمر بن سعد کو

صحابی ثابت کرنے کی کوشش کی اور ابن حجر پر الزام لگانا چاہا کہ انہوں نے اسے ''الاصابہ'' میں بیان فرمایا ہے اور جو غلط روایت اس نے نقل کی کہ عمر بن سعد کو کس طرح صحابی بنانے کی روایت بنائی گئی ہے، مولف نے اسی روایت کو ابن حجر کے نام سے نقل کر دیا، اور ان کی تصحیح روایت اور اصلاح کو چھپایا:

اب ذرا ان کی اس کتاب کو بھی دیکھئے جس سے مؤلف نے پہلے عمر بن سعد کی تابعیت ثابت کی ہے اس ''تہذیب التہذیب'' میں اسی بیان میں یہ عبارت موجود ہے:

[وقال غیره (ای عمرو بن علی) ولد فی عصر النبی ﷺ وقال ابن ابی خیثمة عن ابن معین ولد عام مات عمر رضی الله عنه] (تہذیب التہذیب ۷/۴۵۱)

''اور عمر بن علی کے علاوہ نے کہا کہ عمر بن سعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں پیدا ہوا اور ابن ابی خیثمہ نے یحییٰ بن معین سے روایت کی ہے وہ اس سال پیدا ہوا جس سال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے''۔

یہاں پر عمرو بن علی کے علاوہ سے مراد غالباً وہی ابن فتحون مالکی ہیں، جنہوں نے حافظ ابن عبد البر اندلسی کی الاستیعاب کے ذیل میں عمر بن سعد کے مولود فی عہد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی ایک روایت بیان کی ہے اور اسے ابن حجر نے ''الاصابہ'' میں غلط قرار دے کر امام المحدثین ابن معین کے جزم و یقین والا بیان درج کیا ہے، ابن حجر نے ''تہذیب التہذیب'' میں یہ بھی فرمایا ہے:

[قلت اغرب فتحون فذکره فی الصحابة معتمدا علی ما نقله عن الفتوح وان اباه علی جیش فی الفتوح العراق] (تہذیب التہذیب ۷/۴۵۱)

''میں کہتا ہوں کہ ابن فتحون نے تعجب خیز و غریب کام یہ کیا کہ عمر بن سعد کو صحابہ میں ذکر کیا، اور اس پر اعتماد کیا کہ وہ فتوح میں موجود تھا، اور اس کے والد نے عراق کی فتوحات میں اسے امیر لشکر بنایا تھا''۔

مؤلف کو اتنا بھی خیال نہیں رہا کہ اگر کسی نے ''الاصابہ'' اور ''تہذیب التہذیب'' اٹھا کر دیکھ لیا تو وہ اسے بد دیانتی قرار دے گا یا تحقیق اور ریسرچ کہے گا۔

صحیحین کی حدیث پر بیجا کلام

مؤلف نے عمر بن سعد کو تابعی تسلیم کر کے پھر صحابی ثابت کرنے کے لئے صرف یہی نہیں کیا کہ ابن فتحون کی غلط روایت نقل کی، اور ابن حجر پر الزام لگایا کہ انہوں نے ''الاصابہ'' میں اس کی صحابیت کو بیان کیا ہے نیز ''تہذیب التہذیب'' کی تصریح کو چھپایا، بلکہ انہوں نے بخاری اور مسلم کی ایک صحیح اور بے غبار حدیث پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے، اور اسے محلِ نظر قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

صحیحین کی ایک حدیث میں البتہ یہ بیان ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ علیل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب عیادت کے لئے تشریف لے گئے، انہوں نے عرض کیا میں مالدار ہوں سوائے ایک بیٹی کے میرے مال کا کوئی وارث نہ ہوگا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واقعہ یا توحجۃ الوداع کے وقت کا ہے یا فتح مکہ کے زمانہ کا، اس سے بعض لوگ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ عمر بن سعد کی ولادت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہیں ہوئی تھی، کسی نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ وہ عہدِ نبوی کے نہیں، عہد فاروقی کے مولود تھے''۔ (ص: ۲۱۷)

''اس حدیث سے بعض لوگ تو مطلب نکالتے ہیں'' آپ نے پہلے کس سے یہ مطلب نکالا تھا کہ عمر بن سعد تابعی ہے، جیسا کہ ابن سعد کی طبقات اور حافظ ابن حجر کی ''تہذیب التہذیب'' سے نقل کر کے (صفحہ ۲۱۴) اس کا اعتراف واقرار کیا ہے۔

امام المحدثین یحییٰ بن معین نے اس کی پیدائش اس سال بتائی ہے، جس سال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا، ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی شہادت کے بعد یعنی عہدِ فاروقی کے بعد پیدا ہوا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کے دور خلافت کے آخری چند مہینوں یا چند دنوں میں پیدا ہوا ہو، وہی ابن حجر عسقلانی جن کی کتاب سے آپ نے پہلے عمر بن سعد کی صحابیت ثابت کی ہے، انہوں نے ہی ''الاصابہ'' اور ''تہذیب التہذیب'' میں اسے لکھا ہے، اور امام المحدثین کے اسی قول کو حجت مانا ہے۔

آپ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث ہی اول تو محل نظر ہے، عہد نبوی میں حضرت سعد ایسے مال دار کہاں تھے''۔ (ص: ۲۱۷)

صحیحین کی یہ حدیث جسے آج تک تمام محدثین وشارحین صحیح تسلیم کرتے چلے آئے ہیں، آپ کی نگاہ میں محلِ نظر کیسے بن رہی ہے؟ کیا یہاں پر منکرینِ حدیث کی ہمنوائی کھل کر کرنی ہے؟ اور عمر بن سعد کو صحابی ثابت کرنے کے چکر میں بخاری ومسلم کی حدیث کو بھی غلط قرار دینا ہے؟ یہاں پر آپ حدیث کے بارے میں کھل گئے ہیں اور آپ کا رجحان سامنے آ گیا ہے، عہدِ نبوی میں سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی مالداری آپ کے نزدیک کیوں ثابت نہیں ہے ان کی غربت کی کوئی سند ہے؟

یا آپ اس حدیث کو محلِ نظر قرار دینے کے لئے آپ بلا وجہ کی وجہ نکال رہے ہیں سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے مالدار ہو⑪نے کی سند تو بخاری و مسلم کی یہ بے غبار حدیث ہے مالدار نہ ہونے کا کوئی ایک گرا پڑا قول بھی آپ نے بیان کیا ہے؟

”پھر اگر یہ واقعہ فتح مکہ کے زمانہ کا ہے، اور یہ ثابت ہے کہ عمر بن سعد اپنے باپ کے بڑے بیٹے تھے تو کیا تعجب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے ان کا یہ بیٹا ہو کر وراثت مال کا حق دار بنا ہو رحمۃ اللہ علیہ ⑫ (ص: ۲۱۷)

یہ پوری حدیث ہمارے سامنے ہے، یہ واقع فتح مکہ کا نہیں، بلکہ حجۃ الوداع کے زمانہ کا ہے، یہ بالکل ثابت نہیں ہے کہ عمر بن سعد اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا، بلکہ اس وقت سب سے بڑی ان کی وہ صاحبزادی تھیں جن کے بعد نہ کوئی بہن تھی اور نہ کوئی بھائی تھا، عمر بن سعد کا بڑا بیٹا ہونا آپ کے ذہن میں ثابت ہے یا آپ کے کہہ دینے سے ثابت ہو جائے گا، اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی دعا نہیں دی، جس کی برکت آپ عمر بن سعد کو دینا چاہتے ہیں، وہ بھی ”کیا تعجب ہے“ کے ساتھ یہ آپ کے ذہنی مفروضے اور خیالی کاوشیں بلا کسی دلیل کے ہم کیوں تسلیم کر لیں، جبکہ آپ واقعات و حقائق کے انکار و اخفاء میں بالکل باک نہیں محسوس کرتے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے:

”قطع نظر اس کے جب ان کے پوتے ابو بکر بن حفص بن عمر بن سعد اپنے دادا سے حدیث روایت کرتے ہیں جیسا کہ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے تو بیّن دلیل ہے اس امر کی کہ حضرت عمر بن سعد رضی اللہ عنہ نہ صرف عہد نبوی کے مولود تھے، بلکہ آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر اقل درجہ پر چھ برس کی رہی ہوگی“۔ (ص ۲۱۷، ۲۱۸)

یہ عمر بن سعد کو صحابی ثابت کرنے کی آخری دلیل ہے جو صرف ظن اور تخمینہ سے تیار کی گئی ہے بیشک ابن حجر اور دوسرے ائمہ رجال نے لکھا ہے کہ عمر بن سعد سے اس کے پوتے نے بھی روایت کی ہے، مگر کسی نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ کس قسم کی روایت کی ہے، بات یہ ہے کہ پوتے نے دادا کو نہیں پایا، اور اپنے باپ کے توسط سے دادا سے روایت کی، مرسل منقطع، معضل اور مدلس وغیرہ اسی قسم کی احادیث کو کہتے ہیں، اس بحث کے لئے ”نخبۃ الفکر“ ”مقدمہ ابن صلاح“ اور ”معرفۃ علوم الحدیث حاکم“ کا مطالعہ کیجئے روایت کی بہت سی شکلیں ہیں۔

حدیث غزوہ مدینہ قیصر اور یزید

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ”غزوۃ البحر“ اور ”غزوۃ مدینۃ قیصر“ کو ذرا تفصیل سے بیان کر کے ان سے

یزید کے تعلق کی نوعیت کو واضح کر دیا جائے تا کہ آنے والے مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو، اس تفصیل کو ہم صرف دو ایسے مؤرخوں کی کتابوں سے درج کرتے ہیں، جو مؤلف (محمود احمد عباسی) کے نزدیک نہایت ثقہ و معتبر ہیں، ایک علامہ ابن خلدون کی تاریخ اور دوسری علامہ ابوالحسن بلاذری کی ''فتوح البلدان'' علامہ ابن خلدون کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، علامہ بلاذری نہایت معتبر و مستند مورخ ہیں جن کی دو کتابوں ''فتوح البلدان'' اور ''تنبیہ الاشراف'' کو مؤلف نے اپنا ماخذ بنایا ہے ''فتوح البلدان'' سے صفحہ ۱۵۰، ۳۱۶ وغیرہ پر استدلال کیا ہے اور ''تنبیہ الاشراف'' سے صفحہ ۵۸، ۸۷، ۱۱۸، ۱۴۰، ۱۵۰ صفحہ ۲۸۷، ۳۰۶، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳ وغیرہ میں استدلال فرمایا ہے۔

علامہ بلاذری فتوح البلدان میں ''امر قبرص'' کے بیان میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے بحری جنگ قبرص کے پہلے غزوہ میں کی اس سے پہلے مسلمانوں نے بحر روم پر چڑھائی نہیں کی تھی، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے غزوہ بحر کی اجازت چاہی تھی، مگر آپ نے اجازت نہیں دی، جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے غزوہ قبرص کے بارے میں اجازت طلب کی، اور اس کی قربت اور جنگی آسانی کو بیان کیا، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سن چکے ہیں، اس کے بعد ۲۷ھ۔ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے پھر عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا اور قبرص پر بحری چڑھائی کی آسانیوں کو واضح کیا، آپ نے جواب میں لکھا کہ اسی شرط پر آپ کو غزوہ بحر کی اجازت مل سکتی ہے کہ آپ کی عورت بھی ساتھ رہے گی، اگر یہ شرط منظور ہو تو پھر اجازت ہے ورنہ نہیں، معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس شرط کو منظور کرتے ہوئے بہت سے بحری جہاز لے کر ساحل عکّا سے چڑھائی کی، اور اپنی عورت فاختہ بنت قرظہ کو ساتھ لیا۔ نیز عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اپنی عورت ام حرام بنت ملحان انصاریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ساتھ لیا، یہ واقعہ ۲۸ھ۔ کا ہے جبکہ جاڑے کا موسم ختم ہو چکا تھا، بعض نے ۲۹ھ۔ بتایا ہے، مسلمان ساحل قبرص پر پہنچ کر لنگر انداز ہوئے، اور جب اس کے حاکم کو خبر لگی تو اس نے صلح کا پیغام بھیجا، چنانچہ باشندگان قبرص کی طرف سے گفتگو کے بعد اس شرط پر صلح ہوئی کہ وہ سالانہ سات ہزار دو سو دینار ادا کرتے رہیں گے، نیز بعض اور شرطیں بھی جانبین سے ہوئیں، پھر ۳۲ھ۔ میں اہل قبرص نے بدعہدی کی، تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۳۳ھ۔ میں پانچ سو جہازوں کو لے کر پھر ان پر چڑھائی کی، اور اب کی مرتبہ قبرص کو زبردستی فتح کر کے قتل و غنیمت اور قید و بند کا معاملہ کیا، اور ان کو صلح پر آمادہ کیا، اس کے بعد علامہ بلاذری تصریح فرماتے ہیں:

[وبعث إليها باثني عشر ألفا كلهم أهل ديوان فبنوا بها المساجد، ونقل إليها جماعة من بعلبك وبنى بها مدينة وأقاموا يعطون الأعطية إِلَى أن تُوُفِّيَ معاوية وولى بعده ابنه يزيد فاقفل ذلك البعث وأمر بهدم المدينة وبعض الرواة يزعم أن غزوة معاوية الثانية قبرس في سنة خمس وثلاثين.

وحدثني مُحَمَّد بْن مصفى الحمصي عَنِ الوليد، قَالَ: بلغنا أن يزيد بْن معاوية رشا مالا عظيما ذا قدر حَتَّى أقفل جند قبرس، فلما قفلوا هدم أهل قبرس مدينتهم ومساجدهم] (فتوح البلدان ص :۱۵۴)

’’اور معاویہ ؓ نے قبرص میں دس ہزار فوجی اہل دیوان سے (جن کو خلافت سے وظیفہ ملتا تھا) بھیجا، ان فوجیوں نے وہاں مسجدیں بنائیں، نیز معاویہ ؓ نے بعلبک سے ایک جماعت منتقل کر کے وہاں پر مسلمانوں کا ایک شہر آباد کیا، اور اہل قبرص اپنی رقم ادا کرتے رہے، یہاں تک کہ معاویہ ؓ کی وفات ہوئی، اور ان کے بعد ان کا لڑکا یزید والی ہوا، تو اس نے ان فوجیوں کو وہاں سے واپس بلا لیا، اور ان کے آباد کئے ہوئے شہر منہدم کرنے کا حکم دیا، بعض راویوں کا خیال ہے کہ دوسرا غزوہ قبرص ۳۵ھ۔ میں ہوا اور محمد بن مصفی الحمصی نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ ولید نے کہا کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ یزید نے اہل قبرص سے ایک بہت بڑی رقم رشوت لے کر قبرص کی مسلمانوں کی فوج کو واپس بلا لیا، اور جب وہ لوگ واپس چلے آئے تو قبرص کے باشندوں نے ان کا شہر اور ان کی مسجدیں منہدم کر دیں‘‘۔

اب آیئے یزید کی صاحبزادگی کے زمانہ میں جہاد قسطنطنیہ میں زبردستی بھیجے جانے یا خود جانے کی داستان بھی سنئے، اور حدیث ’’مغفور لھم‘‘ میں اس کے شامل کئے جانے کی کیفیت معلوم کر لیجئے، علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

معاویہ ؓ نے ۵۰ھ۔ میں ایک بہت بڑا لشکر بسر افسری سفیان بن عوف بلادِ روم کی طرف روانہ کیا اور اپنے لڑکے یزید کو بھی ان کے ہمراہ جانے کا حکم دیا، لیکن یزید نے جانا پسند نہ کیا، معذرت کی۔ اس پر معاویہ ؓ نے اس کی (یزید کی) روانگی ملتوی کر دی، اتفاق سے مجاہدین کو اس لڑائی میں اکثر مصائب کا سامنا ہوا، غلہ کی کمی، مرض کی زیادتی سے بہت سے لوگ تلف ہو گئے، یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بے ساختہ اشار ذیل پڑھنے لگا:

[ما أُبالی بما لاقت ماجموعهم بالفرقدونة من حمیٰ ومن شوم]

’’مجھ کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے کہ ان کے لشکر کو فرقدونہ میں سختی اور بدبختی کا سامنا ہوا‘‘۔ [1]

[اذا اتکات علی الانماط مرتفعاً بدیر مرّان عندی ام کلثوم]

’’جبکہ میں نے بلند ہو کر رنگ برنگ قالینوں پر تکیہ لگایا یا دیر مرّان میں اور میرے پاس (میری بیوی) ام کلثوم ہے‘‘۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کے کانوں تک ان اشعار کی آواز پہونچ گئی، یزید کے بھیجنے کی قسم کھالی، چنانچہ یزید کو ایک جمعیت کثیرہ کے ساتھ جن میں ابن عباس، ابن عامر، ابن زبیر، ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم بھی تھے، روانہ کیا ان لوگوں نے میدان جنگ میں پہونچ کر نہایت تیزی اور سختی سے لڑائی شروع کی، لڑتے بھڑتے قسطنطنیہ تک پہونچے، رومیوں نے قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے معرکہ آرائی کی، ان ہی معرکوں میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، اور قسطنطنیہ کی شہر پناہ کی دیوار کے نیچے دفن کر دیئے گئے، یزید اور شامی فوجیں شام کو لوٹ آئیں‘‘۔ (تاریخ ابن خلدون ۵ / ۲۳-۲۴)

غزوہ قبرص میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت وامارت میں ہوا، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس میں شریک ہونے والوں نے اپنے لئے جنت واجب کر لی ہے [قداوجبوا] اور یزید نے اپنے دورامارت وخلافت میں وہاں جو پارٹ ادا کیا، اور اسلامی شان وشوکت کو جس انداز سے نقصان پہونچایا اسے علامہ بلاذری نے بیان کر دیا ہے، اور جہاد قسطنطنیہ جس کے شرکاء کو زبان رسالت نے ’’مغفور لھم‘‘ کی بشارت دی، اس میں یزید نے اپنی صاحبزادگی کے زمانہ میں کس طرح شرکت کی، اسے علامہ ابن خلدون نے بیان کر دیا ہے۔

مؤلف نے صفحہ ۲۱ سے صفحہ ۳۰ تک اور صفحہ ۳۱۰ سے صفحہ ۳۱۵ تک بڑی تفصیل کے ساتھ یزید کے جہاد قسطنطنیہ میں امیر ہونے، اور اس کی وجہ سے مغفور ہونے کو بیان کیا ہے، یزید کی مغفرت نہ ہونے کا کوئی قائل نہیں، اللہ تعالیٰ جسے چاہے بخش دے، اس کی رحمت اور اس کے رحم وکرم کو کون روک سکتا ہے؟ اور رحمت خداوندی اور گناہ گار بندہ کے درمیان حائل ہونے کی مجال ہے؟

قرآن کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے گناہ کو معاف کر سکتا ہے، اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ گناہ کرنے سے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، مسلمان کافر نہیں ہوتا گناہ گار رہتا ہے، اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے چاہے سزا دے، چاہے معاوف کر دے، اگر اللہ تعالیٰ یزید کو سراسر معاف کر دے تو کسی کا اجارہ نہیں، اور اگر بقدر جرم سزا دے کر مغفرت کرے تب بھی کسی کو حرف گیری کا حق نہیں، ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ بڑے سے بڑے

گناہ گار مسلمان کی مغفرت ہوگی، اب یہ اس کے اور اللہ کے درمیان کی بات ہے کہ پوری سزا بھگتنے کے بعد یا پہلے ہی، اس کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا۔

بخاری شریف میں یہ حدیث متعدد مقامات پر آئی ہے، مثلاً کتاب الاستیذان کے باب میں ''من زار قوماً فقال عندھم'' میں کتاب الجہاد کے باب غزوہ ''المرآۃ فی البحر'' میں، نیز کتاب الجہاد کے باب ''من یصرع فی سبیل اللہ فمات فھو منھم'' میں باب ''ما قیل فی قتال الروم'' میں، اس حدیث کے الفاظ میں بہت ہی کم اختلاف ہے، ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

[يقول اول جيش من امتى يغزون البحر قد اوجبوا قالت ام حرام قلت يا رسول الله انا فيهم قال انت فيهم ثم قال النبى ﷺ اوّل جيش من امتى يغزون مدينة قيصر مغفور لهم ، قلت انا فيهم يا رسول الله قال لا] (بخارى كتاب الجهاد ، باب ، قيل فى قتال الروم)

''میری امت کا جو پہلا لشکر بحری جہاد کرے گا ان لوگوں نے اپنے اوپر جنت کو واجب کرلیا ہے، ام حرام رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ان میں سے ہوں گی؟ آپ نے فرمایا ہاں تم ان میں سے ہو، پھر آپ نے فرمایا، میری امت کا جو پہلا لشکر قیصر کے شہر کا جہاد کرے گا ان لوگوں کے لئے مغفرت ہوچکی ہے، ام حرام رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ میں ان میں سے ہوں، تو آپ نے فرمایا نہیں''۔

پہلا بحری غزوہ جیسا کہ معلوم ہوا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوا، اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت میں ان کے اصرار سے ہوا، جس میں ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہ اپنے شوہر کے ساتھ شریک ہوئیں، اور قبرص میں اپنی سواری سے گر کر شہید ہوئیں، اور وہیں دفن ہوئیں، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی اور بشارت ان کے حق میں خلافت عثمانی میں ظاہر ہوئی۔

اور مدینہ قیصر یعنی قسطنطنیہ پر پہلی فوج کشی معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت و امارت میں یزید کی امارت و قیادت میں ہوئی، اس موقع پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کتاب الجہاد باب ''ما قیل فی قتال الروم'' میں مفصل بحث کی ہے اور اسی سلسلہ بحث میں لکھا ہے:

[قال المهلب فی هذا الحديث منقبة المعاوية لانه اول من غزا البحر ، ومنقبة لولده يزيد لانه اول من غزا مدينة قيصر ، وتعقبه ابن التين وابن المنير ، بما حاصله انه لا يلزم من دخوله فی ذلك العموم ان لا يخرج بدليل خاص ، اذ لا تختلف اهل العلم ان قوله ﷺ " مغفور لهم " مشروط بان يكونوا من اهل المغفرة حتی لو ارتد واحد ممن غزاها بعد ذلك لم يدخل فی ذلك العموم اتفاقاً فدل علی ان المراد مغفور لمن وجد شرط المغفرة فيه منهم واما قول ابن التين ان يكون لم يحضر فمردود الا ان يزيد ، لم يباشر القتال فيمكن فانه كان امير ذلك الجيش بالاتفاق] (فتح الباری ۷۸/۷ طبع مصر)

’’مہلب نے کہا ہے کہ اس حدیث میں معاویہ ؓ کی منقبت ہے، کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے بحری جہاد کیا ہے، اوراسی طرح ان کے لڑکے یزید کی منقبت ہے کیونکہ اس نے سب سے پہلے مدینہ قیصر کا غزوہ کیا ہے، اور مہلب کے اس قول کا ابن التین اور ابن المنیر نے تعاقب کر کے اس پر اعتراض کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے یزید کے اس عام حکم (مغفور لھم) میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا ہے وہ خاص دلیل کی وجہ سے نہ نکل سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ’’مغفور لھم‘‘ اس شرط سے مشروط ہے کہ وہ لوگ مغفرت کے اہل بھی ہوں یہاں تک کہ جن لوگوں نے مدینۂ قیصر کا جہاد کیا ہے ان میں سے کوئی آدمی بعد میں مرتد ہو جائے تو وہ اس حکم عام (مغفور لھم) میں باتفاق داخل نہیں ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ اس سے مراد اس شخص کی مغفرت ہے جس کے اندر مغفرت کی شرط پائی جائے، اور ابن التین کا یہ کہنا کہ احتمال ہے کہ یزید حاضر نہ رہا ہو، غیر معتبر ہے، البتہ اس سے یہ مراد ہو کہ وہ قتال میں شریک نہیں ہوا تو ممکن ہے، اس لئے کہ یزید بالاتفاق اس لشکر کا امیر تھا‘‘۔

مؤلف (محمود احمد عباسی) نے ص ۲۳ پر حاشیہ صحیح بخاری ۴۱۰/۱ کے حوالہ سے محدّث کا قول نقل کر کے ترجمہ کیا ہے:

[قال المهلب فی هذا الحديث منقبة المعاوية لانه اول من غزا البحر ، ومنقبة لولده يزيد لانه اول من غزا مدينة قيصر]

’’اس حدیث کے بارے میں (محدّث) مہلب نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منقبت میں ہے حضرت معاویہ ؓ کے کہ انہوں نے سب سے پہلے بحری جہاد کیا، اور منقبت میں ہے ان کے فرزند امیر یزید کے کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر جہاد کیا‘‘۔

مؤلف نے اس موقع پر مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے مکتوبات سے ایک عبارت نقل کی، جس میں علمی خیانت سے کام لے کر درمیان سے کچھ جملے حذف کر دیئے۔

صفحہ ۲۹ پر ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

”یزید کو متعدد معارکِ جہاد میں بھیجنے اور جزائر، بحر ابیض اور بلاد ہائے ایشیائے کوچک کے فتح کرنے حتیٰ کہ خود استنبول (قسطنطنیہ) پر بڑی افواج سے حملہ کرنے وغیرہ میں آزمایا جاچکا تھا، تاریخ شاہد ہے کہ معارکِ عظیمہ میں یزید نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، ۔۔۔۔۔ (یہاں سے عبارت حذف ہے) ۔۔۔۔ خود یزید کے متعلق بھی تاریخی روایات مبالغہ اور آپس کے تخالف سے خالی نہیں“۔

درمیان سے جو عبارت مصنف نے حذف کر دی وہ یہ ہے:

”اس کے فسق وفجور کا علانیہ ظہور ان (معاویہ رضی اللہ عنہ) کے سامنے نہ ہوا تھا، اور خفیہ جو بداعمالیاں وہ کرتا تھا اس کی اطلاع ان کو نہ تھی“۔ (مکتوب شیخ الاسلام ۱/۲۶۷)

اس کے بعد جو عبارت نقل کی ہے وہ اس جگہ کی نہیں ہے، بلکہ کسی دوسری جگہ سے لا کر جوڑ ملایا ہے۔

غزوۃ البحر میں یزید کی صاحبزادگی کے زمانہ میں جو کام کیئے اور غزوہ مدینہ قیصر میں شرکت وامارت جس انداز سے کی، اس کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ مشکل نہیں ہے کہ یزید بے حساب وکتاب ”مغفور لھم“ کی صفت میں ہے یا اسے مجازات جزا وسزا سے نپٹنا بھی پڑے گا، اس میں شک نہیں کہ اس عموم میں یزید کی ذات بھی آتی ہے، بشرطیکہ کوئی بات اس سے مانع نہ ہو، ورنہ ”عام مخصوص منہ البعض“ کا معاملہ ہوگا، اور جس طرح ۔۔۔ ”من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ“ میں صرف زبان سے یہ کلمہ پڑھ لینا ہی دخول جنت کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کی اہلیت کے لئے مزید چیزیں درکار ہیں، اسی طرح صرف ”غزوہ مدینۂ قیصر“ کی شرکت وامارت ”مغفور لھم“ میں داخل ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، اس کے لئے اہلیت بھی ضروری ہے مگر یزید کے اندر اس کی اہلیت ہے تو وہ یقیناً اس معنیٰ ”مغفور لہ“ ہے کہ وہ صرف اسی ایک عمل کی وجہ سے بے حساب وکتاب مغفرت کا مستحق ہے، محدث ابومہلب نے اسی بات کو یزید کے بارے میں واضح کیا ہے کہ وہ مستحق مغفرت ہے، مگر ان کے اس قول کے مقابلہ میں دو محدث ابن التین اور ابن المنیر نے کہا ہے کہ اگر اس کے اندر اس کی صلاحیت واہلیت ہوگی تو وہ مستحق مغفرت ہے، ورنہ نہیں، پھر اہل سنت والجماعت اور اہل حق کے نزدیک کسی

بھی شخص کے بارے میں، جنتی، مغفور، یا دوزخی ہونے کا اعتقاد رکھنا اس وقت تک صحیح نہیں جب تک کہ نص صریح سے اس کا ثبوت نہ ہو، کہ وہ خاص شخص جنتی یا دوزخی ہے، البتہ عام صفت اور عام حکم کی رو سے عام حکم لگایا جاسکتا ہے، کہ جو آدمی فلاں کام کرے گا وہ ایسا ہوگا، اس مذہب حق کی رو سے بھی کسی ایسے شخص کے بارے میں جنتی ہونے کا قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا جو کسی صفت عام کی رو سے اہل جنت میں داخل ہوسکتا ہے جیسے ہر لا الہ الا اللہ کہنے والے کو جنتی ہونے کا قطعی حکم لگانا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے بعد اس میں اہلیت وصلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔

مؤلف نے اس سلسلہ میں یزید کی فضیلت بیان کرتے ہوئے سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات اور اس کی امامت کا تذکرہ کیا ہے، اور دوسرے شرکاء کی اس اقتدا میں نماز جنازہ ادا کرنے کی تصریح علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی اس عبارت سے کی ہے، ”وکان (ابو ایوب) فی جیش یزید بن معاویة والیه هو الذی صلی علیه “(ص: ۲۷) جہاں تک یزید کے نماز جنازہ پڑھانے کا تعلق ہے وہ فضیلت یوں نہیں ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے یزید کو نماز جنازہ پڑھانی چاہیے تھی، کیونکہ وہ اس وقت امیر لشکر بنایا گیا تھا، اور امیر و والی کی موجودگی میں کسی دوسرے کو شرعاً نماز جنازہ پڑھانے سے منع کیا گیا ہے الاّ یہ کہ وہ حکم دے۔

اور جہاں تک علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تصریح کا تعلق ہے، مؤلف نے حسب عادت اپنے ذوق کے مطابق سیاق وسباق کا لحاظ کئے بغیر ایک ٹکڑا لے لیا ہے چنانچہ مذکورہ بالا عبارت کے آخر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

[قال حدثنا اسحق بن عیسیٰ قال حدثنی محمد بن قیس قاضی عمر بن عبد العزیز عن ابی حرمة عن ابی ایوب الانصاری انه قال حین حضرته الوفاة قد کنت کتمت عنکم شیئا سمعته من رسول الله ﷺ سمعته یقول لو لا انکم تذنبون یخلق الله قوماً یذنبون فیغفرلهم و عندی ان هذا الحدیث والذی قبله حمل یزید بن معاویة علی طرف من الارجاء ، ورکب بسببه افعالا کثیرة انکرت علیه] (البدایه والنهایه ۵۹/۸)

”امام احمد بن حنبل نے کہا ہم سے اسحق بن عیسیٰ نے بیان کیا کہ ہم سے عمر بن عبدالعزیز کے قاضی محمد بن قیس نے بیان کیا ابو حرمہ سے، انہوں نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے کہ جب ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں سے ایک حدیث جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے چھپائے ہوئے تھا، میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق کو پیدا فرماتا جو گناہ کرتی، اور اللہ اس کی مغفرت

کرتا (علامہ ابن کثیر ﵀ کہتے ہیں) میرے نزدیک اس حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث کی وجہ سے یزید جری ہو گیا، اور مغفرت کی امید پر اس نے ایسے بہت سے افعال کا ارتکاب کیا جو اس کی ملامت کا باعث بنے‘‘۔

اس سے پہلے والی حدیث ’’من مات لا يشرك بالله شيئاً جعل الله في في الجنة‘‘ ہے، اسی طرح یزید نے معاویہ ﵁ سے اپنے ولی عہد بننے کا اصرار کرتے ہوئے ایک حدیث بیان کی تھی، اور کہا تھا:

[لانی وجدت فی الآثار من تقلد امر الامة ثلاثة ایام حرمه علی النار] (ص :۶۴)

ہوسکتا ہے کہ ان روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ نے یزید کو جیسا کہ علامہ ابن کثیر ﵀ کا خیال ہے، مرجئہ کی صف اوّل میں کھڑا کر دیا ہو، اور اس نے اپنی بے راہ روی کی بنیاد پر ان ہی روایات پر رکھ کر اپنے آپ کو جری بنا لیا ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ غزوہ مدینہ قیصر میں ’’مغفور لھم‘‘ ہونے کے خیال نے اور بھی جری بنا دیا ہو، اور اس نے یہ سمجھ کر کہ لا الہ الا اللہ کہہ لینا دخولِ جنت کے لئے ضامن ہے، شرک پر اصرار نہ کرنا جنت کا پروانہ ہے، تین دن تک خلیفہ بن جانا بھی نارِ جہنم سے آزادی کے لئے کافی ہے اور اگر ہم لوگ گناہ کے کام نہ کریں تو اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کو پیدا کر کے ان کی مغفرت کرے گا، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ شہر قسطنطنیہ پر فوج کشی مغفرتِ عامہ کا سبب ہے، وہ سب کچھ کیا جو اسے نہ کرنا چاہیے تھے، اور مولف بھی یزید کو مغفور لھم میں داخل کر کے اسے بغیر کسی قسم کی باز پرس اور سزا کے براہ راست مغفرت اور جنت کا وارث بنا رہے ہیں، مولف کو بھی معلوم ہوگا کہ ’’ارجاء‘‘ اور مرجئیت نے بنوامیّہ کے دور میں ان ہی حالات میں جنم لیا، اور حکمرانوں کی خرابی کو برداشت کرنے کے لئے اس وقت کی سیاست نے یہ ذہن پیدا کیا، اور بڑے بڑے گناہ کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت کی ’’رجاء‘‘ اور امید کا نظریہ پیش کیا اور ہر طرح کے گناہ اور گناہ گار کو انگیز کر کے اس کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ ختم کرنے کی کوشش کی، فرقہ مرجئہ کے استدلالات کا بھی یہی رنگ ڈھنگ ہے جس کا اظہار اس بحث میں کیا گیا ہے۔

حدیث ملک عضوض

مؤلف کتاب ’’خلافت معاویہ ؓ و یزید‘‘ اپنی بے لاگ تحقیق اور ریسرچ کے چکر میں صرف ثقہ مورخوں کو ہی نہیں سب کچھ بنایا، بلکہ مشہور محدثین اور احادیث کے راویوں پر بھی ہاتھ صاف کیا، خاص طور پر امام ترمذی ﵀ اور امام ابوداؤد ﵀ کے متعلق باور کرانے کی کوشش کی کہ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں موضوع حدیثیں بیان کی ہیں اور وہ بھی سیدنا

معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کی مخالفت میں غلط اقدام کے مرتکب ہوئے ہیں اس سلسلے میں آپ نے فن اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل پر بھی دست درازی فرمائی ہے۔

مؤلف صفحہ ۳۳۷ پر یہ بیان کرتے ہوئے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا زمانہ علی منہاج النبوۃ تھا، اور اس کی برکات خلیفہ سوم سیدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک باقی رہیں، لکھتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مقتل عثمان رضی اللہ عنہ سے فتنہ رونما ہونے کے بارے میں ''احادیث متواتر بالمعنیٰ'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

[دریں وقت خلات علیٰ منہاج النبوۃ منقطع شود، وملکِ عضوض پدید آید ومعنیٰ ملک عضوض دلالت می کند بہد حروب و مقاتلات جہیدن یکے بد دیگیے ومنازعات یکے بادیگیے] (ازالۃ الخفاء)

''اس وقت خلافت علی منہاجِ نبوت منقطع ہوجائے گی، اور ملک عضوض ظاہر ہوگا، اور ملک عضوض کے معنی دلالت کرتے ہیں جنگوں اور قتالوں پر اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرنا، اور ایک دوسرے سے جھگڑنا''۔

چونکہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ تک برکات خلافت کو ختم کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ چہارم کے دور کو ناکام ثابت کرنا ہے، اس لئے اس حدیث کو شاہ ولی اللہ کے حوالے متواتر بالمعنیٰ مان کر بیان کیا گیا ہے، اور اسے نہ صرف صحیح بلکہ متواتر بالمعنیٰ تسلیم کیا گیا اور واقعی یہ حدیث متواتر بالمعنیٰ ہے بھی یہ حدیث اپنے الفاظ کے اعتبار سے مختلف طریقوں سے آئی ہے، مگر معنیٰ اور مفہوم سب کا ایک ہی ہے جو تواتر کی حد تک پہنچا ہے۔

پھر مؤلف نے صفحہ ۳۳۴ پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برکات وخدمات کو انتہائی زوردار بیان سے ادا کیا، اور اس کے فضائل ومناقب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ترمذی اور ابوداؤد کی ایک حدیث کو موضوع قرار دینے کی جرأت کی، یہ حدیث وہی ہے جسے شاہ ولی اللہ صاحب کے حوالے سے آپ نے متواتر بالمعنیٰ تسلیم کیا ہے، مگر چونکہ اس کے الفاظ سے آپ کا مقصد فوت ہورہا تھا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت وامارت اس حدیث میں داخل نہیں ہورہی تھی، اس لئے آپ نے امام ترمذی اور امام ابوداؤد پر موضوع حدیث بیان کرنے کا الزام لگایا ہے اور فن جرح وتعدیل اور حدیث دانی کی وہ داد دی کہ سبحان اللہ آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور وہ ''خلافت راشدہ'' کیوں نہ کہلائے کیا محض اس لئے کہ اس کو ''ملک عضوض'' کا نام دیا جائے کہ خلیفہ راشد'' ازالۂ مادۂ مرض'' اور ''جلب صحت طبیعت عالم'' کی غرض سے ایسی تدبیر اختیار کرنے پر مجبور ہو، جس کو آج کی اصطلاح میں ''مارشل لا'' کہتے ہیں، اور وہ بھی ایک علاقہ سے فتنہ وفساد کے دفعیۂ کے لئے ایک حدیث وضع کی گئی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ قول منسوب کیا گیا الخلافة فی امتی ثلاثون سنة ثم ملك (ص:۳۴۴)

یہاں پر مناسب ہے کہ پہلے پوری حدیث بیان کردی جائے سننِ ترمذی باب (ماجاء فی الخلافہ) میں ہے:

[حدثنا احمد بن منيع نا شريح بن نعمان نا حشرج بن نباتة عن سعيد بن جمهان قال ثنی سفينة قال قال رسول الله ﷺ الخلافة فی امتی ثلاثون سنة ثم ملك بعد ذلك ثم قال لی سفينة امسك خلافة ابی بكر ، ثم قال و خلافة عمر ، و خلافة عثمان ثم قال امسك خلافة علی فوجدناها ثلاثين سنة ، قال سعيد فقلت له ان بنی امية يزعمون ان الخلافة فيهم قال كذبوا بنوالزرقاء بل هم ملوك من شر الملوك وفی الباب عمر عمر و علی قالا لم يعهد النبی ﷺ فی الخلافة شيئًا و هذا حديث حسن قد رواه غير واحد عن سعيد بن جمهان ولا نعرفه الا من حديثه]

''امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن منیع نے بیان کیا کہ ہم سے شریح بن نعمان نے بیان کیا کہ ہم سے حشرج بن نباتہ نے سعید بن جہمان سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ مجھ سے سفینہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خلافت میری امت میں تیس سال تک رہے گی، اس کے بعد مُلک ہوجائے گی، یہ کہہ کر سفینہ نے مجھ سے کہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت لو، پھر کہا اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت لو، پھر کہا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت لو تو ہم نے ان سب کی مدت تیس سال پائی سعید راوی کہتے ہیں کہ میں نے سفینہ رضی اللہ عنہ سے کہا بنی امیّہ کے لوگ کہتے ہیں کہ خلافت ان کے اندر ہے تو سفینہ نے کہا بنوزرقاء (مروان) جھوٹ کہتے ہیں، بلکہ وہ لوگ بدترین بادشاہوں سے ہیں، اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کے بارے میں کوئی بات نہیں فرمائی، یہ حدیث حسن ہے اسے سعید بن جہمان سے کئی لوگوں نے روایت کیا ہے، اور ہم سعید کو اسی حدیث سے جانتے ہیں۔

اسی حدیث کو امام ابوداؤد نے اس طرح بیان کیا ہے:

[حدثنا سوار بن عبد الله نا عبد الوارث بن سعيد عن سعيد بن جمهان ، عن سفينة

قال قال رسول الله ﷺ خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم يوتى الله الملك من يشاء قال[1] سعيد قال لى سفينة امسك عليك ابا بكر سنتين و عمر عشرا ، و عثمان اثنتى عشرة ، و على كذا قال سعيد قلت سفينة ان هؤلاء يزعمون ان عليًا لم يكن بخليفة ، قال كذبت استاه بنى الزرقاء يعنى بنى مروان]

’’امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ ہم سے سوار بن عبداللہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہم سے عبدالوارث بن سعید نے بیان کیا، انہوں نے سعید بن جمہان سے، انہوں نے سفینہ سے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نبوت کی خلافت تیس سال تک ہے، پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا، ملک دے گا، سعید کا بیان ہے کہ سفینہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دو سال لو اور عمر رضی اللہ عنہ کے دس سال لو اور عثمان رضی اللہ عنہ کے بارہ لو، اور علی رضی اللہ عنہ کے اتنے سال لو سعید نے کہا کہ میں نے سفینہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ یہ لوگ (بنومروان) کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ خلیفہ نہیں تھے، انہوں نے کہا بنوزرقاء (بنو مروان) کی گانڈیں جھوٹ بولتی ہیں‘‘۔

ابوداؤد کی اسی حدیث کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنہ میں جگہ جگہ ذکر فرمایا ہے اور اسے صحیح مانا ہے، اور کسی قسم کا کلام نہیں فرمایا، بلکہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

[نحن نقول خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم صارت ملكا كما ورد الحديث] (المنتقیٰ ص ۲۸۱)

’’اور ہم کہتے ہیں کہ نبوت کی خلافت تیس سال ہے پھر خلافت ملوکیت بن گئی جیسا کہ حدیث میں وارد ہے‘‘۔

غور کرنے کی بات ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسے علم و تحقیق کے بحر ذخار اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید اور بنوامیّہ کی طرف سے شیعوں کے مقابلہ میں مدافعت اور احادیث و آثار پر بے باکانہ خیالات ظاہر کرنے والے امام تو اس حدیث کو تسلیم کر کے بار بار ذکر کریں مگر مؤلف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بھی چار قدم آگے ہیں، اور چونکہ اس حدیث میں بنی مروان کی امارت و خلافت کو نبوت کی خلافت نہیں تسلیم کیا جا رہا ہے، اور زبان رسالت کی رو سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور خلافت کے تحت نہیں آتا، اور سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کی شرح میں کھل کر بنی مروان پر تنقید کی، اور ان کے اس دعویٰ کو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ نہیں ہیں، غلط کہہ کر خود ان کو شر الملوک کہا ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کی ہوئی یہ حدیث موضوع ہونی ہی چاہئے، بلا سے امام ترمذی اور امام ابوداؤد پر موضوع حدیث بیان

کرنے کا الزام آئے، اور بلا سے اس حدیث کے راویوں کی عدالت وثقاہت خاک میں مل جائے، مگر مؤلف، خلافت معاویہؓ ویزید کی بات اونچی ہی رہنی چاہیے، اور رہی حدیث جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کو نا کام ثابت کرنے کے سلسلے میں متواتر بالمعنی تسلیم ہو چکی ہے، اگر وہی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے زمانہ کے خلاف پڑے اور اس سے ان کی خلافت و امامت علی منہاج النبوۃ ثابت نہ ہو سکے تو اس سے انکار کر دینا چاہیئے، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ روش نہایت شرمناک ہے۔

''اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة'' سیوطی موضوعات ملا علی قاری موضوعات ''علامہ طاہر گجراتی''، موضوعات مقدسی، مضوعات صنعانی لاہوری وغیرہ چھپ کر عام طور سے ملتی ہیں اور موضوع اور جعلی حدیثوں کے پرکھنے میں کام آتی ہیں ان کتابوں میں حدیث کے اماموں نے موضوع احادیث کو جمع کر دیا ہے، کیا مؤلف ان کتابوں میں سے کسی کتاب میں ''الخلافہ بعدی'' والی حدیث کو موضوع یا ضعیف دکھا سکتے ہیں؟

اس حدیث کو موضوع بتانے کی جرأت آپ کو ''العواصم من القواصم'' کے حاشیہ سے یا پھر ''المنتقی'' کے صفحہ ۵۷ کے حاشیہ سے ہوتی ہے، جس میں محشی نے اپنے کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بھی دو قدم آگے سمجھا ہے، اور اس حدیث کی غیر منطقی تاویل کر کے اس۔۔۔۔۔ کے رواۃ پر کلام کیا ہے مگر ہمارے محقق تو اپنے پیش رو کی تقلید بھی نہ کر سکے اور اس کی چال میں اپنی چال بھول گئے، اس راز کو صیغہ راز ہی میں رہنا بہتر ہے۔

[حشرج بن نباتہ کوفی رحمہ اللہ]

مؤلف اس حدیث کے موضوع ہونے کی پہلی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

''اوّل تو اس کے راوی حشرج بن نباتہ الکوفی تقریباً تمام ائمہ رجال کے نزدیک ضعیف الحدیث اور لا یحتج بہ ہیں منکر الحدیث ہیں'' (ص ۳۲۶)

جن ائمہ رجال کے نزدیک حشرج بن نباتہ کوئی ضعیف الحدیث لا یحتج بہ، اور منکر الحدیث ہیں۔ ان میں سے کم سے کم دو چار کے نام تو بیان فرمائیے، اور ان کتابوں کی نشان دہی کیجیے، جن میں حشرج کو یہ سب کچھ کہا گیا ہے، یہ حشرج بن نباتہ کوفی تو جرح وتعدیل کے اماموں کے نزدیک ثقہ، صالح اور لا باس بہ ہیں، امام ابن ابی حاتم رازی رحمہ اللہ نے ''کتاب الجرح والتعدیل'' میں ان کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

[حشرج بن نباتة الاشجعى كوفى روىٰ عن سعيد بن جهمان ، روىٰ عنه ابو نعيم و ابو الوليد و شجاع بن الاشرس سمعت ابى يقول ذلك ، وحدثنا عبد الرحمٰن ، نا محمد بن حمويه بن الحسن قال سمعت ابا طالب قال سالت احمد بن حنبل عن حشرج بن نباتة فقال ثقة ، حدثنا عبد الرحمٰن قال ذكره ابن عن اسحاق بن منصور عن يحيىٰ بن معين ، قال حشرج بن نباتة وقال لا باس به حديثه مستقيم ، هو واسطى ، سمعت ابى يقول حشرج بن نباتة صالح يكتب حديثه ولا يحتج] (كتاب الجرح والتعديل ٢٣٧/١ قسم دوم)

”حشرج بن نباتہ اشجعی کوفی ہیں، انہوں نے سعید بن جمہان سے روایت کی ہے اور ان سے ابونعیم اور ابوالولید اور شجاع بن اشرس نے روایت کی ہے، یہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے ہم سے عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ ہم سے محمد بن حمویہ بن حسن نے بیان کیا کہ ابوطالب کا بیان ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے حشرج بن نباتہ کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا وہ کوفی ہیں، ثقہ ہیں، اسحاق بن منصور کی روایت یحییٰ بن معین سے ہے کہ حشرج بن نباتہ صالح ہیں، امام ابوزرعہ سے حشرج بن نباتہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ ان سے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ان کی حدیث مستقیم ہے، وہ شہر واسط کے رہنے والے ہیں، میں نے اپنے والد (ابوحاتم رازی) سے سنا ہے کہ حشرج بن نباتہ صالح ہیں، ان کی حدیث لکھی جائے اور اسے حجت نہ بنایا جائے“۔

اس بیان میں تمام ائمہ فن رجال امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، اور امام ابوزرعہ رحمہم اللہ نے حشرج کو ثقہ اور صالح ثابت کیا ہے، صرف امام ابوحاتم رازی نے ان کو ”صالح یکتب حدیثہ“ (یعنی وہ صالح ہیں، ان کی حدیث لکھی جائے) کے ساتھ ”لا یحتج“ فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ کسی حدیث میں منفرد ہوں، اور اس کے راوی دوسرے لوگ نہ ہوں تو ان کی اس حدیث کو حجت نہ بنایا جائے، کیا ایک امام زرعہ تمام ائمہ رجال ہیں جن کے نزدیک حشرج سے احتجاج جائز نہیں ہے، پھر امام ابوزرعہ کا یہ قول جیسا کہ ہم نے بتایا، ان احادیث کے بارے میں ہے جن میں حشرج منفرد ہوں، اور ”الخلافہ بعدی“ والی حدیث کو ایک جماعت نے بیان کیا ہے جیسا کہ امام ترمذی نے فرمایا ہے: ”قد رواہ غیر واحد عن سعید بن جمہان“ چنانچہ ابوداؤد میں یہ حدیث حشرج بن نباتہ کے بجائے سعید بن جمہان سے عبدالوارث بن سعید نے بیان کی ہے، فرمائیے عبدالوارث بن سعید کے بارے میں کیا ارشاد ہے، نیز اس حدیث

کے دیگر راویوں کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

[1]

نیز ابن حجر نے ’’تہذیب التہذیب‘‘ میں حشرج بن نباتہ کوفی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان سے بقیہ بن مخلد یونس المودّب، عبداللہ بن مبارک، ابوداؤد طیالسی، ابوالولید طیالسی، شریح بن نعمان جوہری، بشر بن ولید کندی، یحییٰ عمانی اور دوسرے لوگوں نے روایت کی ہے۔

ان تمام راویوں، اور اماموں کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، کیا انہوں نے ضعیف، منکر الحدیث اور لا یحتج سے روایت کی ہے؟ حافظ ابن حجر نے بھی ان ہی اماموں کے ان ہی اقوال کو حشرج کے بارے میں نقل کیا ہے۔

[سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن جمہان رحمہ اللہ]

مؤلف (محمود احمد عباسی) نے اس حدیث کو موضوع ثابت کرنے کی دوسری وجہ یہ لکھی ہے:

’’یہ حشرج سعید بن جمہان بصری سے روایت کرتے ہیں جن کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی، اور سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا، ان دونوں کے سنین وفات میں ۶۲ برس کا فرق ہے‘‘۔ (ص ۳۴۴)

آپ کا مطلب یہ ہے کہ سعید بن جمہان اور سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لقاء نہیں ہے اور سعید نے ان کا زمانہ پایا ہی نہیں، کیونکہ دونوں کے سنین وفات میں بڑا فرق اور فصل ہے، آپ کے اس مفروضہ کی بنا پر محمد بن المنکدر کی وفات چونکہ ۱۳۰ھ۔ یا ۱۳۱ھ۔ میں ہوئی، لہٰذا سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ سے ان کی روایت بھی صحیح نہیں ہونا چاہیئے، حالانکہ تمام محدثین اسے تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح ائمہ رجال نے سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ سے سعید بن جمہان کے روایت کرنے کی تصریح کی ہے، اور وہ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ظاہر کرتے، حافظ ابن حجر ’’تہذیب التہذیب‘‘ میں سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کے حال میں لکھتے ہیں:

[روی عنه ابناه عبد الرحمن و عمر وسعيد بن جمهان و ابو ريحانة و سالم بن عبد الله بن عمر و عبد الرحمٰن بن ابی نعيم ، والحسن البصری وغيره] (تہذیب التہذیب : ۴/ ۱۲۵)

’’سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ سے ان کے دولڑکوں عبدالرحمن اور عمر، اور سعید بن جمہان، ابوریحانہ، سالم بن عبداللہ بن عمر، عبد

الرحمن بن ابونعیم، اور حسن بصری وغیرہ نے روایت کی ہے"۔

حافظ ابن عبد البر اندلسی قرطبی لکھتے الاستیعاب میں لکھتے ہیں:

[و توفیٰ سفینة فی زمن الحجاج ، روی عنه الحسن ، و محمد بن المنكدر ، و سعيد بن جمہان] (الاستیعاب ۶۰۱/۲)

"سفینہ ؓ نے حجاج کے زمانہ میں وفات پائی، ان سے حسن بصری محمد بن منکدر اور سعید بن جمہان نے روایت کی ہے"۔

اسماء الرجال کے ائمہ رجال ورواۃ کے موالید ووفیات کے بارے میں آپ سے زیادہ واقف ہیں، اور اسماء الرجال میں پیدائش اور وفات کے سنین پر ان کی نظر بہت کڑی ہوتی ہے، آپ مقدمہ ابن الصلاح، معرفۃ علوم الحدیث للحاکم وغیرہ مطالعہ فرماتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم وخبر کے سامنے آپ کے اس قسم کے احتمال کی کیا حیثیت ہے؟

اس کے بعد آپ اس حدیث کو موضوع بنانے کی تیسری وجہ بیان کرتے ہیں:

"پھر یہ سعید تو بصرہ کے رہنے والے تھے، اور حضرت سفینہ ؓ مدنی ہیں اور وہیں ان کی وفات ہوئی، انہوں نے یہ حدیث ان سے کب اور کیوں کر کہاں سنی؟ سیدنا سفینہ ؓ کے علاوہ اور کسی صحابی کا ایسی حدیث کا جو نظامِ خلافت کو صرف تیس برس تک قائم رہنے کی پیش گوئی کرے، روایت نہ کرنا ہی اس کے وضعی ہونے کا بیّن ثبوت ہے"۔ (ص: ۳۴۵)

تب تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ سیدنا سفینہ ؓ سے امام حسن بصری ؒ نے بھی روایت نہیں کی، اور یہی تمام سوالات آ کر بصرہ کے رہنے والے حسن ؒ کو مدینہ کے رہنے والے سفینہ ؓ سے روایت کرنے سے روک دیں گے۔

نیز اس زمانہ میں پورے عالم اسلام میں جو علمی اور دینی اسفار ورحلات ہوتے تھے وہ سب غلط اور جھوٹ ہو جائیں گے، نہ اندلس کے یحیٰ بن یحیٰ نے مدینہ منورہ کے امام مالک کی شاگردی کی نہ امام بخاری نے اپنے زمانہ کے عالم اسلام کے علماء سے علم حاصل کیا، اور نہ ہی ان سے دنیا کے مختلف ممالک کے تقریباً نوے ہزار علما نے ان کی کتاب صحیح بخاری پڑھی، کہاں بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ، مکہ، اور کہاں بخارا، خراسان، سندھ، نیشاپور، ہرات، سمرقند، کاشغر، افریقہ، اندلس، اور شام؟

بھلا ان مقامات کے لوگوں نے ایک دوسرے کے علوم وفنون کب اور کیونکر اور کہاں حاصل کئے ہوں گے؟ قارئین فیصلہ کریں کہ اس قسم کی باتیں کرنے والے علم وتحقیق کے معیار پر کہاں تک پورے اتر سکتے ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ اور کسی صحابی نے ایسی روایت نہیں کی اور یہ بھی اس کے وضعی یعنی موضوع ہونے کا بیّن ثبوت ہے، گویا ہر وہ حدیث جو کسی خاص امر سے تعلق رکھے، اور اس کے راوی صحابہ کرامؓ میں زیادہ نہ ہوں، وہ موضوع ہونی چاہیئے۔ پھر آپ ’’ملک عضوض‘‘ والی حدیث کو شاہ ولی اللہ کے حوالے سے متواتر بالمعنیٰ تسلیم کر کے نقل کر چکے ہیں۔ (ص:۳۳۷) اگر اس کے راوی صرف سیدنا سفینہؓ ہی ہوتے تو متواتر بالمعنیٰ کا اطلاق اس پر کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ چونکہ آپ کے علم میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ صرف سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کے یہاں ملی ہے اس لئے دیگر حضرات کے روایت کرنے کو نہیں جانتے، یہ بات اور اس قسم کی علم حدیث و رجال کی باتیں اس وقت معلوم ہوں گی جب آپ حدیث و رجال کی کتابیں پڑھیں گے۔

[امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ]

اہل سنت والجماعت کے مشہور و مسلم امام احمد بن حنبل بن عبداللہ بن حنبل شیبانی رحمہ اللہ کی ذات دین و دیانت اور تمسک بالسنۃ میں جو مقام و مرتبہ رکھتی ہے، اس سے ہر مسلمان واقف ہے، دیکھئے امام رحمہ اللہ حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کو جس طرح حجت و قابل استناد قرار دیتے ہیں، اور اس ’’سید المسلمین فی الحدیث‘‘ نے اس حدیث کو کیا درجہ دیا ہے؟ امام ابن جوزی رحمہ اللہ جیسے ناقد حدیث اور جرح و تعدیل میں سخت محدث نے اپنی کتاب ’’مناقب امام احمد حنبل‘‘ میں اپنی سند سے روایت کی ہے کہ محدث یعقوب بن اسحاق بغدادی کا بیان ہے کہ امام احمد سے تفضیل صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں سوال کیا گیا:

[فقال علىٰ حديث ابن عمر ، ابو بكر و عمر و عثمان ، والخلافة على حديث سفينة ابو بكر ، وعمر و عثمان ، و على ، فقال له من ساله هذا حشرج فقال ، لا ، حماد بن سلمة يعنى ان حماد بن سلمة و حشرج بن نباتة رويا هذا الحديث حديث سفينة ، و فى حشرج غمص ، و حماد بن سلمة امام] (مناقب الامام احمد ص :۱۵۹-۱۶۰ طبع مصر)

’’تو آپ نے کہا کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق افضل صحابہ رضی اللہ عنہم ابو بکر، عمر، اور عثمان رضی اللہ عنہم ہیں، اور خلیفہ

حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کی رو سے ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم ہیں، سائل نے کہا کہ اس روایت میں حشرج ہیں تو آپ نے فرمایا نہیں، حماد بن سلمہ بھی ہیں، یعنی حماد بن سلمہ اور حشرج بن نباتہ دونوں ہی نے اس حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ الخلافہ بعدی ثلاثون سنۃ کی روایت کی ہے، اور حشرج میں کچھ عیب ہے تو حماد بن سلمہ تو امام حدیث ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے چاروں خلفاء کو ثابت کرنے کے لئے حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کو حجت بنایا ہے، اور حشرج راوی کے ضعف کو اس حدیث کے دوسرے راوی امام حماد بن سلمہ کی امامت کی وجہ سے حدیث کی قطعیت میں حارج نہیں مانا ہے، قارئین کرام فیصلہ کریں کہ حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام الفقہاء سید المحدثین اور حجۃ الاسلام امام احمد بن حنبل کا قول معتبر و مستند مانا جائے گا یا مؤلف خلافت معاویہؓ و یزید کی حدیث دانی پر اعتماد کر کے اس بے غبار حدیث کو جعلی وضعی اور موضوع سمجھا جائے گا؟

ممکن ہے اس عبارت میں لفظ ''یعنی'' کے بعد کی تصریح کو کوئی شخص امام ابن جوزی رحمہ اللہ یا سائل یا اور کسی کی تشریح و توضیح کہے، اور اسے امام احمد بخاری کی دو حدیثیں تقتلہ فئۃ الباغیۃ / ھلاک امتی علی یدی اغلیمۃ سفہاء کا مقولہ نہ قرار دے، مگر سیاق و سباق سے اس کی گنجائش نہیں ہے پھر اگر ایسا ہو بھی تو امام صاحب کا اس حدیث کو خلفائے اربعہ کے بارے میں حجت قرار دینا اور حشرج کی توثیق کے لئے امام حماد بن سلمہ جیسے مسلّم امام الحدیث کو اس حدیث کے راویوں میں مان کر حشرج کے ضعف کی پرواہ نہ کرنا، اور ہر حال میں حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کو استدلال میں پیش فرمانا اس حدیث کے صحیح اور قابل حجت ہونے کو ثابت کرتا ہے اگر مؤلف کتاب ''خلافت معاویہؓ و یزید'' کو احادیث پر کلام کرنے کا شوق تھا تو پہلے کچھ اس کی تیاری فرما لیتے اور علم الحدیث اور علم الرجال سے واقفیت حاصل کر لیتے۔

بخاری کی دو حدیثیں تقتلہ فئۃ الباغیۃ /
ھلاک امتی علی یدی اغلیمۃ سفہاء

خلافت بنوامیّہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کی امامت و خلافت کو خلافت راشدہ ثابت کرنے کے لئے آپ نے سارا زور خرچ کیا اور اس کے لئے تاریخوں کا ستیاناس کیا، اور احادیث کو موضوع اور راویوں کو مجروح بتایا، حالانکہ اگر آپ کے پاس صاف ستھرا دماغ اور جیتا جاگتا دل ہوتا تو آپ صحیح روایات و احادیث کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا کوئی محل اور

محمل تلاش کرتے، اور علم و تحقیق کی روشنی میں تمام روایات صحیحہ ثابتہ کو اپنے محل و معنی پر لا کر کوئی اچھی راہ پیدا[1] کرتے۔

آپ ترمذی اور ابوداؤد کی ''الخلافہ بعدی'' والی حدیث ہی کو کیوں موضوع اور جعلی قرار دیتے ہیں اور امام ترمذی اور امام ابوداؤد اور ان کے راویوں ہی کو کیوں مجروح ثابت کرتے ہیں؟ امام بخاری کی بھی خبر لیجئے، اور ان پر بھی جعلی و موضوع حدیث نقل کرنے کا الزام لگایئے انہوں نے صحیح بخاری میں باب التعاون فی بناء المسجد میں سیدنا ابوسعیدؓ سے روایت کی ہے۔

[كنا نحمل لبنة لبنة و عمار لبنتين ، لبنتين فرآه النبى ﷺ فجعل ينفض التراب عنه ويقول ويح عمار تقتله الفئة الباغية يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار قال يقول عمار اعوذ بالله من الفتن] (بخاری)

''مسجد نبوی کی بناء کے وقت ہم لوگ ایک ایک اینٹ اٹھا کر لاتے تھے، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ایک ساتھ دو دو اینٹیں اٹھا کر لاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دیکھا تو آپ ان کے غبار جھاڑنے لگے، اور فرمانے لگے ہائے عمار ان کو باغی گروہ قتل کرے گا، یہ ان کو جنت کی دعوت دیں گے۔ اور وہ ان کو جہنم کی دعوت دیں گے راوی کا بیان ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ میں فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں''۔

فرمایئے، سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں میں سے کس کی طرف تھے، اور کس گروہ نے ان کو قتل کیا ہے؟ صحابی رسول ہونے کے ذاتی مناقب و فضائل سر آنکھوں پر، مگر فتنہ باغیہ (باغی گروپ) کون تھا، جسے زبان رسالت بتا رہی ہے کہ وہ آگ کی طرف دعوت دے گا، اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ اسے جنت کی دعوت دیں گے، اور وہی فتنہ'' باغیہ'' ان کو قتل کرے گا۔

(۲) مؤلف نے صفحہ ۲۳۲ پر بخاری کے باب اذا قال عند قوم شيئاً ثم خرج فقال بخلافه سے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، اس کے مقابلہ میں یہ واقعہ آپ کی نظر سے گذرا ہے یا نہیں۔

[عن ابى المنهال قال لما كان ابن زياد و مروان بالشام ، وثب ابن الزبير بمكة وثب القراء بالبصراء ، فانطلقت مع ابى الى ابى برزة الاسلمى حتىٰ دخلنا عليه فى داره وهو جالس فى ظل علية له من قصب فجلسنا اليه فأنشأ ابى يستطعمه بالحديث ، فقال يا ابا برزة

الا ترى ، ما وقع فيه الناس فاوّل شيئ سمعته تكلم به انى احتسبت عند الله انى اصبحت ساخطاً على احياء قريش انكم يا معشر العرب كنتم على الحال الذى علمتم من الذلة والقلة والضلالة وان الله انقذكم بالاسلام ، و بمحمد ﷺ حتى بلغ بكم ما ترون و هذه الدنيا التى افسدت بينكم ، ان ذاك الذى بالشام والله ان يقاتل الا على الدنيا] (بخارى كتاب الفتن)

’’ابوالمنہال سے مروی ہے کہ جب عبیداللہ بن زیاد اور مروان بن حکم شام میں حکمران ہوئے، اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ میں اور قراء (علماء) کی جماعت نے بصرہ میں سرگرمی دکھائی تو میں اپنے والد کے ہمراہ سیدنا ابو برزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب ہم لوگ ان کے مکان پر پہونچے وہ بانس کی ایک چھپر کے سایہ میں بیٹھے تھے، ہم لوگ بھی ان کے پاس بیٹھ گئے میرے والد ان سے بات چیت کرنے لگے اور کہا کہ اے ابو برزہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کس حال میں پڑ گئے ہیں؟ اس سوال کے بعد ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے سب سے پہلی بات جو میں نے سنی یہ تھی کہ میں نے تو اللہ کے یہاں اجر وثواب کی نیت کرلی ہے، میں قریش کے قبائل سے ناراض ہو چکا ہوں، اے گروہ عرب، تم لوگ ذلت وقلت اور گمراہی کی جس حالت میں پڑے تھے، وہ تمہیں خوب معلوم ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے نجات دی، یہاں تک کہ اب تم ایسی حالت کو پہونچ گئے ہو جسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، اور یہ دنیا ہے جس سے تمہارے درمیان فساد ڈال دیا ہے، یہ جو شام میں ہے اللہ کی قسم صرف دنیا کے لئے لڑ رہا ہے‘‘۔

اس واقعہ میں ’’ ان ذاك الذى بالشام ‘‘ کی تشریح حافظ ابن حجر فتح الباری میں یوں فرماتے ہیں:

[وفى رواية يزيد بن زريع يعنى مروان وفى رواية مسكين عبد الملك بن مروان ، والاول اولیٰ] (فتح البارى ۱۳/ ۳۴)

’’یزید بن زریع کی روایت میں ہے اس سے مراد مروان ہے، اور مسکین کی روایت میں عبدالملک بن مروان ہے، مگر پہلی بات زیادہ مناسب ہے‘‘۔

فرمایئے سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ اور امام بخاری کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

(۳) امام بخاری نے کتاب الفتن میں باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم هلاك على امتى يدى اغليمة سفهاء (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کہ میری امت کی ہلاکت و بربادی کمینے نوعمروں کے ہاتھ سے ہوگی) میں یوں روایت ہے:

[حدثنا موسىٰ بن اسمٰعيل قال حدثنا عمرو بن يحيى ابن سعيد بن عمرو بن سعيد ، قال اخبرنى جدى قال كنت جالسا مع ابى هريرة فى مسجد النبوى ﷺ بالمدينة و مروان معنا قال ابو هريرة سمعت الصادق المصدوق ﷺ يقول هلكة امتى على ايدى غلمة من قريش ، فقال مروان لعنة الله عليهم غلمة فقال ابو هريرة ان اقوال بنى فلاں وبنى فلاں لفعلت فكنت اخرج مع جدى الى بنى مروان ، حين ملكوا بالشام فاذا راهم غلمانا احداثاً ، قال لنا عسىٰ هؤلاء ان يكونوا منهم قلنا انت اعلم] (بخارى كتاب الفتن)

”ہم سے موسیٰ بن اسمٰعیل نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا کہ ہم سے عمرو بن یحییٰ بن سعید بن عمرو بن سعید نے بیان کیا ہے کہ مجھے میرے دادا سعید بن عمرو نے خبر دی کہ میں سیدنا ابو ہریرہ ؓ کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا تھا، اور ہمارے ساتھ مروان بن حکم بھی تھا، اس وقت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت کی ہلاکت و تباہی قریش کے کچھ نوعمر لڑکوں کے ہاتھوں سے ہوگی، یہ سن کر مروان نے کہا ”ان نوعمروں پر اللہ کی لعنت ہو“ سیدنا ابو ہریرہ ؓ نے اس وقت یہ بھی کہا کہ اگر میں بنی فلاں بنی فلاں نام بنام کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں، اس کے بعد جب بنی مروان شام کے حکمران ہوئے تو میں اپنے دادا کے ہمراہ ان کے پاس جایا کرتا تھا جب میرے دادا ان نوخیزوں کو دیکھتے تو فرماتے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ ان ہی میں سے ہوں ہم لوگ کہتے کہ اس کو آپ زیادہ جانتے ہیں “۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بازار میں چلتے ہوئے یہ دعا مانگتے تھے۔

[اللهم لا تدركنى سنة ستين ولا امارة الصبيان]

”اے اللہ سن ساٹھ کا زمانہ اور لڑکوں کی حکمرانی کا دور مجھے نہ ملے“۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ۶۰ ھ۔ میں نوعمروں کا پہلا زمانہ ہوگا، اور ہوا بھی ایسا ہی، اس لئے کہ یزید بن معاویہ اسی سن میں خلیفہ بنایا گیا‘‘۔ (فتح الباری ۱۳/ ۸)

نیز اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

[وان اولهم يزيد كما دل عليه قول ابى هريرة راس الستين ، و امارة الصبيان فان يزيد كا غالبا ينتزع الشيوخ من امارة البلدان الكبار ويوليها الاصاغر من اقاربه] (فتح البارى ۱۳/۸)

’’ان نوخیزوں میں سب سے پہلا یزید ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول سن ساٹھ اور بچوں کی حکمرانی سے معلوم ہو رہا ہے کیونکہ یزید عام طور سے بڑوں کو بڑے شہروں کی امارت سے علیحدہ کر کے ان پر اپنے رشتہ داروں میں سے چھوٹوں کو حاکم بنا تا تھا‘‘۔

یہ قریش کے نوخیز لوگ کون تھے، جن کے ہاتھوں امت مسلمہ کی تباہی کی خبر صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے کیا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یا امام بخاری رحمہ اللہ کی شان میں جرات دکھانے کا ارادہ ہے؟

بارہ قریشی خلفاء

حدیث ملک عضوض کے سلسلے میں مؤلف لکھتے ہیں:

’’حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ دین اسلام قوت سے رہے گا، یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہوں گے اور وہ سب قریش سے ہوں گے۔’’لا يزال الاسلام عزيزا الى اثنى عشرة خليفة كلهم من قريش‘‘ (الخ ص ۳۴۵) ان بارہ خلیفوں میں پانچویں امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور چھٹے امیر المومنین یزید ہوتے ہیں (الخ ص ۳۴۵)

یہ حدیث صحیح مسلم میں اس طرح مروی ہے:

[عن عامر بن سعد بن ابى وقاص قال كتبت الى جابر بن سمرة مع غلامى نافع ان اخبرنى بشئى سمعته من رسول الله ﷺ يقول يوم جمعة عشية رجم الاسلمى يقول لا

یزال الدین حتی تقوم الساعة و یکون علیکم اثنا عشر خلیفة کلهم من قریش الخ[1]]

”عامر بن سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ میں نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے غلام نافع کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ سنا ہو تو مجھے بتائیے اس کے جواب میں انہوں نے میرے پاس لکھا کہ میں نے جمعہ کے دن جس کی شام کو ماعز اسلمی کو رجم کیا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ دین اسلام قیامت کے قائم ہونے تک جاری رہے گا، یہاں تک کہ تمہارے اوپر بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔

جیسا کہ مؤلف نے بیان کیا اگر اس سے مراد خلفائے راشدین اور خلفائے بنی امیہ ہیں تو پھر ان کی تعداد بارہ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

(۱) سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

(۲) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ

(۳) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ

(۴) سیدنا علی رضی اللہ عنہ

(۵) سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ

(۶) یزید بن معاویہ

(۷) معاویہ رحمہ اللہ بن یزید

(۸) مروان بن حکم

(۹) عبد الملک بن مروان

(۱۰) ولید بن عبد الملک

(۱۱) سلیمان بن عبد الملک

(۱۲) عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ

(۱۳) یزید بن عبد الملک

(۱۴)　ہشام بن عبد الملک

(۱۵)　ولید بن یزید

(۱۶)　یزید بن ولید

(۱)　ابراہیم بن ولید

(۱۸)　مروان بن محمد آخر خلیفہ اموی۔

اس کے بعد خلفائے عباسیہ کی ابتداء ہوتی ہے، اور وہ بھی قریش ہی سے تھے، اگر مؤلف کے مطلب کے مطابق اس حدیث سے بالترتیب بارہ قریشی خلفاء مراد ہیں جس کی رو سے پانچویں خلیفہ حضرت معاویہ ؓ چھٹا خلیفہ یزید ہے تو پھر ان بارہ کے بعد کے قریشی خلفاء کا کیا ہوگا؟ کیا سیدنا عمر بن عبد العزیز ؒ کے بعد ہی اسلام کی قوت وشوکت ختم ہوگئی؟ اور بعد میں جو قریشی خلفاء اور حکمران ہوئے ان میں کوئی بھی اس حدیث میں نہیں آسکتا، اگر یہ بات ہے تو پھر حتیٰ تقوم الساعۃ کا کیا مطلب ہے، اور دین قیامت تک کیسے طاقت وشوکت رکھ سکے گا۔

جاہ طلبی اور امارت کا شوق

مؤلف نے یزید کے کردار کے بیان میں اس کے بچپن ہی سے امیر وخلیفہ ہونے کے شوق کو نہایت اچھے انداز میں علامہ ابن کثیر کی روایت سے بیان کیا ہے، جب کہ ایک مرتبہ سیدنا معاویہ ؓ نے یزید سے کہا کہ تم مجھ سے کوئی حاجت طلب کرو، تو یزید نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص تین دن تک اس امر خلافت کا ذمہ دار ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر آگ کو حرام فرما دیتا ہے، اس لئے مجھے آپ امیر بنا کر آگ سے آزاد کرایئے۔ اور سیدنا معاویہ ؓ نے اسے ولی عہد بنایا۔ (ص:۴٦)

اس حدیث کو طلب امارت کے لئے استدلال میں لانا ظاہر ہے، کہ حسن طلب کی لطیف قسم ہے، اسی طرح مؤلف نے اس واقعہ کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے، جس میں ہے کہ یزید نے سیدنا معاویہ ؓ سے خواہش کی آپ اس سال کی عسکری مہم مسلمانان پر مجھے تعینات کیجئے (ص:۳۱۱)۔

یزید کی امارت وولایت کی اس طلب وخواہش کو مؤلف نے اس کے فضائل ومناقب میں شمار کیا ہے، اور اس سے اس

کے جوش جہاد اور جذبہ خدمت خلق پر استدلال فرمایا، اور اس کو اس کے بلندی درجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

حالانکہ امارت وولایت کی خواہش اور عہدہ ومنصب کی طلب اسلام کی بخشی ہوئی مخلصانہ ذہنیت کے سراسر خلاف ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے شدت سے منع فرمایا ہے، اور امارت وولایت کے خواہاں کو دنیا وآخرت میں ناکام بتایا ہے، اور ایسے لوگوں کی ہمت افزائی نہیں فرمائی ہے جن میں عہدہ ومنصب اور امارت وولایت کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے، اس کے لئے ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں۔

[عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال انكم ستحرصون على الامارة ، وستكون ندامة يوم القيامة (بخاری) عن عبد الرحمن بن سمرة قال قال لی رسول الله ﷺ يا عبد الرحمٰن بن سمرة لا تسئل الامارة فانك ان اعطيتها عن مسالة وكلت اليها وان اعطيتها عن غير مسألة اعنت عليها] (بخاری و مسلم)

”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب تم لوگ امارت کے حریص بن جاؤ گے، اور امارت قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگی، عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عبد الرحمن! تم امارت کا سوال مت کرنا کیونکہ تم اگر سوال کرنے کی وجہ سے امیر بنائے گئے ہو تو تم کو اس پر مسلط کر دیا جائے گا، اور اگر بغیر سوال کئے تم کو امیر بنایا گیا تو تمہاری مدد کی جائے گی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دو آدمی حاضر ہوئے اور دونوں نے باری باری سے گزارش کی کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس چیز کا والی وامیر بنایا ہے مجھے بھی والی وامیر بنایئے، آپ نے فرمایا:

[انا والله لا نولی على هذا العمل احدا سأله ولا احدا حرص عليه] (بخاری و مسلم)

”اللہ کی قسم ہم اس معاملہ کا کسی ایسے شخص کو والی وامیر نہیں بناتے جو اس کا سوال کرے یا اس کا حریص ہو“۔

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ الا تستعملنی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے مونڈھے پر رکھ کر فرمایا:

[يا ابا ذر انك ضعيف و انها امانة وانها يوم القيامة خزی و ندامة الا من اخذها بحقها ، وادى الذی عليه فيها] (مسلم)

''اے ابوذر رضی اللہ عنہ تم ضعیف ہو، امارت بار امانت ہے، اور وہ قیامت کے دن رسوائی و شرمندگی ہے، الّا یہ کہ کوئی آدمی اسے اس کے حق کے ساتھ لے، اور امارت کے سلسلے میں جو اس کا فریضہ ہے اسے ادا کرے''۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انصار کے ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! جس طرح آپ نے فلاں آدمی کو عامل بنایا، اسی طرح کیا مجھے عامل نہیں بنائیں گے آپ نے فرمایا:

[انکم سترون بعدی اثرة فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض] (بخاری و مسلم)

''تم لوگ میرے بعد بہت جلد دیکھو گے کہ ایک کا حق دوسرے کو دیا جاتا ہے، اس لئے صبر کرو یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے ملو''۔

ان احادیث کی روشنی میں یزید کے امیر و ولی عہد بننے کی خواہش کے بارے میں یہ فیصلہ آسان ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ بات مستحسن اور باعث اطمینان ہے یا بری، اور انجام کے اعتبار سے وبال ہے، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو طالب جاہ اور حب دنیا میں گرفتار قرار دے کر ان کو مطعون کرنے والے بتائیں کہ یہ یزید نے کیا کیا ہے اور اس میں طلب جاہ وحب دنیا کہاں تک پائی جاتی ہے اور ایسا کرنے والے اسلام کی نظر میں کیسے قرار پاتے ہیں، اور اس کام کی طرف داری کرنا اسلامی تصور کے کہاں تک مناسب ہے؟

قرابتیں اور رشتہ داریاں

مؤلف نے اموی خاندان اور اہل بیت کے مابین قرابتوں کا بیان بہت تفصیل سے کیا ہے، جسے بعض لوگ اس کتاب کی خصوصی چیز قرار دیتے ہیں، اللہ کرے یہ قرابتیں اس سے بھی زیادہ رہی ہوں، اور ان کے درمیان صلح ومحبت کی فضا پیدا ہوگئی ہو، مگر مؤلف کے بیان پر اس بارے میں اعتماد کرنا اس لئے مشکل ہے کہ دوسرے مضامین کی طرح انہوں نے اس میں بھی اپنی روش خاص سے کام لیا ہے، اور ریسرچ اور تحقیق کی قینچی سے واقعات میں کانٹ چھانٹ کی ہے، اور اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لئے غلط کاروائیاں کی ہیں، دو ایک مثال ملاحظہ ہوں:

مؤلف صفین و کربلا کے بعد کی قرابتیں کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تین صاحبزادیاں بنی امیہ کو بیاہی گئیں:

(۱) رملہ: امیر المؤمنین مروان کے فرزند معاویہ سے

(۲)   دوسری صاحبزادی خود امیر المومنین عبدالملک سے

(۳)   تیسری صاحبزادی خدیجہ عبداللہ بن کریز اموی کے فرزند عبدالرحمن سے ملخصا (ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

اب سنئے علامہ ابن قتیبہ کتاب المعارف میں جس سے مؤلف نے جگہ جگہ اپنی کتاب میں اقتباس لیا ہے لکھتے ہیں، سیدنا علی ؓ صاحبزادیوں میں ام کلثوم کبری اور زینب کبریٰ سیدۃ فاطمہ ؓ کے بطن سے تھیں، ام کلثوم صغریٰ، زنیب صغریٰ، جمانہ، خدیجہ، فاطمہ، ام الکرام، نفیسہ، ام سلمہ، امامہ مختلف امہات الولد سے تھیں، پھر لکھتے ہیں کہ زینب کبریٰ عبداللہ بن جعفر سے بیاہی تھیں، ام کلثوم کبری عمر بن خطاب ؓ سے، اوران کی شہادت کے بعد محمد بن جعفر بن ابی طالب سے، ان کے مرنے کے بعد عوف بن جعفر بن ابی طالب سے بیاہی تھیں۔

[وکان سائر بنات علی عند ولد عقیل و ولد العباس خلا ام الحسن فانها کانت عند جعدة بن هبيرة المخزومی ، و خلا فاطمة فانها كانت عند سعيد بن الاسود من بنی الحارث ابن اسد]

”ان کے علاوہ سیدنا علی ؓ کی تمام بیٹیاں سیدنا عقیل ؓ اور سیدنا عباس ؓ کی اولاد سے بیاہی تھیں سوائے ام الحسن کے کہ وہ جعدہ بن ہبیرہ مخزومی کے یہاں تھیں، اور سوائے فاطمہ کے کہ وہ سعید بن اسود کے یہاں تھیں جو کہ بنی حارث بن اسد سے تھے“۔

علامہ ابن قتیبہ کے اس بیان کی روشنی میں مؤلف کتاب خلافت معاویہؓ و یزید کا بیان ملاحظہ فرمائیے، اور فیصلہ کیجئے کہ کس کی بات صحیح ہوسکتی ہے، مؤلف اولاد حسین ؓ کی قرابتیں کے ذیل میں لکھتے ہیں، حضرت حسین ؓ کی مشہور صاحبزادی سیدہ سکینہ نے اپنے شوہر مصعب بن زبیر کے مقتول ہوجانے کے کچھ عرصہ بعد اپنا نکاح ایک اموی اور مروانی خاندان مین امیر المومنین مروان کے پوتے الاصبغ بن عبدالعزیز بن مروان سے کہا الخ (ص: ۲۵۲)

اس کے حوالہ جات میں کتاب المعارف کا بھی حوالہ ہے، حالانکہ کتاب المعارف میں جس انداز سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے قرابت ہونے کے باوجود دوری کا ثبوت ملتا ہے، اور خود بنوامیّہ کی طرف سے اس کا ظہور ہوتا ہے، علامہ ابن قتیبہ لکھتے ہیں:

”سکینہ سے مصعب بن زبیر نے نکاح کیا، اس کے فوت ہوجانے کے بعد عبداللہ بن عثمان بن عبداللہ بن حکیم بن حزام

نے ان سے نکاح کیا، ان کے یہاں سکینہ کے بطن سے قرین پیدا ہوئے، پھر اصبغ بن عبدالعزیز بن مروان نے سکینہ سے نکاح کیا:

[و فارقها قبل ان يدخل بها]

’’مگر ازدواجی تعلق سے پہلے ہی اصبغ نے سکینہ کو جدا کر دیا‘‘۔

یہ جملہ مؤلف نے حذف کر دیا حالانکہ اسی سے حقیقت کی عقدہ کشائی ہوتی ہے اصبغ کے الگ کر دینے کے بعد زید بن عمرو بن عثمان بن عفان سے نکاح کیا مگر اب کی مرتبہ بھی اس میں دخل دیا گیا، اور زبردستی طلاق دلوائی گئی۔

[فامر سليمان بن عبد الملك بطلاقها ففعل وماتت بالمدينة فى خلافة هشام] (المعارف ص : ۹۴)

’’خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے زید بن عمرو کو حکم دیا کہ وہ سکینہ کو طلاق دے چنانچہ اس نے طلاق دے دی اور سکینہ کا انتقال مدینہ میں ہشام کے دورِ خلافت میں ہوا‘‘۔

علامہ ابن قتیبہ کی اس تصریح سے اولادِ حسین رضی اللہ عنہ اور بنوامیّہ کے درمیان کی اس رشتہ داری کی حقیقت بخوبی معلوم ہو رہی ہے، مگر مؤلف کتاب جوشِ حمایت میں رشتہ پر رشتہ قائم کئے جا رہے ہیں، اور علیحدگی کو نہایت خوبصورت طور سے بیان کر رہے ہیں، ملاحظہ ہو:

’’سیدہ سکینہ دخترِ حسین رضی اللہ عنہ کا ایک اور نکاح حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن عمرو بن عثمان سے ہوا، پھر اس اموی شوہر سے علیحدگی ہوگئی‘‘۔ (ص: ۲۵۳)

علیحدگی کے ساتھ ساتھ اموی شوہر کا جوڑ بلیغ ہے، قرابتوں کے سلسلے میں یہ دو ایک نشاندہی سارے مضمون کو نامعتبر بتا رہی ہے، اور بغیر تحقیق کے اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے ساتھ حسن سلوک

مؤلف نے ص: ۱۹ سے ۲۰ تک حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے ساتھ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حسن سلوک اور داد و دہش کا تذکرہ کیا ہے، اور بتایا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو یزید بھی سال بہ سال ان کی حاضری کے موقع پر گراں قدر رقم دیا کرتا تھا، اور

آپ اس کے پاس جایا کرتے تھے، اس سے جہاں زر و جواہر کی بارشوں سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کی اسلامی بیت المال، اور امت کی دولت سے سخاوت کرنے کا ثبوت ملتا ہے، وہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ان دونوں سے حسن تعلقات کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ ان حضرات نے صلح ہو جانے کے بعد کس قدر رکھ رکھاؤ باقی رکھا، اور خود مدینہ منورہ سے دمشق جایا کرتے تھے، مگر داد و دہش کی داستانیں بھی دوسرے واقعات کی طرح صرف مؤلف کے بیان پر قابل اعتماد نہیں ہیں، پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ سخاوت چند مصالح کی بنا پر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ پورے اہل حجاز کو اسی طرح نوازتے تھے، اور ان کو ان کی خاطر مرغوب تھی، اور تمام اہل عراق کو نوازتے تھے کہ ان کو اپنے اور یزید کے حق میں ہموار کرنا تھا، اور آخر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس سخاوت و بخشش سے گھبرا گئے تھے، اور اسلامی بیت المال کی دولت میں اس سے نمایاں کمی محسوس کرنے لگے تھے، اور فوجیوں کی تنخواہ کے علاوہ سخاوت کی وجہ سے خزانہ میں کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا، چنانچہ آپ نے امیر مصر سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک موقع پر لکھا:

[اما بعد فان سوال اهل الحجاز و زوار اهل العراق قد كثروا على وليس عندى فضل عن عطيات الجنود فاعنى بخراج مصر هذه السنة] (الاخبار الطوال ص ۲۴۴)

”حجازیوں کے سائل اور عراقیوں کے ملاقاتہ میرے یہاں بہت زیادہ ہو گئے ہیں، اور میرے پاس فوج کے وظائف کے سوا رقم باقی نہیں رہی، اس لئے تم اس سال مصر کے خراج سے میری اعانت کرو“۔

اس خط کے جواب میں سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تین اشعار لکھ کر بھیج دیئے جن میں صریح انکار تھا۔

[فلما رجع الجواب الى معاوية قدمهم فلم يعاوده فى شيئ من امرها]

”معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جب ان کا یہ جواب آیا تو انہوں نے اسے برا مانا، اور پھر اس بارے میں کچھ نہیں لکھا پڑھی کی“۔

جو لوگ مؤلف کی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں جری ہیں، اور ان کی زبان کھل چکی ہے، وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس داد و دہش اور سخاوت سے طرح طرح کے الزامات رکھ سکتے ہیں، مگر ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اس میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصالح ملیہ کی راہ سوچی تھی اور اپنے اجتہاد سے کام لیا تھا بعض کوتاہ بینوں اور سطحی ذہن والوں کا خیال ہے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے گرانقدر وظیفے لئے، اور آخر میں ان کے بیٹے کے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ مخالف

ہو گئے، ان کوتاہ بینوں کے نزدیک اگر یہ رشوت تھی، جسے لے کر سیدنا حسین ؓ کو خاموش ہو جانا چاہئے تھا، شاید ان کو معلوم نہیں ہے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یزید کی بیعت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ جو رقم معاویہ ؓ نے دی ہے کیا اس سے میرا دین وایمان خریدنا مقصود ہے، یہی جواب سیدنا حسین ؓ کا بھی ہے۔

(اختتام)

مسلم ورلڈ ڈیٹا پروسیسنگ پاکستان